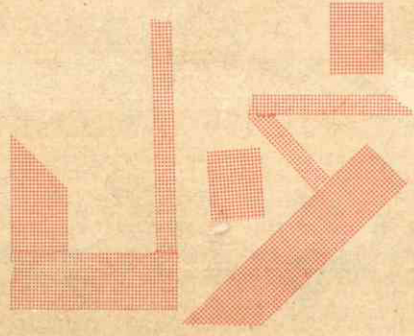
ہفت روزہ
الفتح
کراچی
۲۷ جنوری - ۳ فروری ۱۹۷۲ء

۲۷ ارب روپے زرمبادلہ میں سے
صرف چار کروڑ روپے واپس



یحییٰ، نوابزادہ شیر علی اور نواب قزلباش کا مشترکہ سفرِ عیاشی

قیمت: ـــــ ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے: ـــــ ۷۵ پیسے



دن تھک گیا تو رات کے سائے میں سو گیا
سورج سمٹ کے اپنے اُجالے میں کھو گیا

شب بھر سیہ پہاڑ کو ہم کاٹتے رہے
ظلمت چھٹی تو اور بھی اندھیرا ہو گیا

کتنا سِتم ظریف تھا ابرِ بہار بھی
اِن لازوال پلکوں میں موتی پرو گیا

تھے آئینے میں کتنے ہی چہرے سجے ہُوئے
میں اپنی شکل دیکھ کے مبہوت ہو گیا

فارغؔ کوئی نہ ماپ سکا دل کے درد کو
ہر غمگسار پند کے نشتر چبھو گیا

فارغؔ بخاری

اداریہ

خفیہ ملاقاتیں ہو رہی ہیں

عوام کے خلاف ایک نیا محاذ بن رہا ہے سازشوں کا جال پھیلایا جا رہا ہے۔ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ خفیہ جلسے ہو رہے ہیں۔ اس محاذ میں جو لوگ شریک ہیں۔ ان میں سرمایہ دار ہیں، جاگیردار ہیں اور نوکر شاہی کے کارندے ہیں اسلام پسند بھی ہیں اور ترمیم پسند بھی ہیں۔ اس محاذ کا ترجمان اخبار "ڈان" ہے۔ جو ہارون برادرز کی ملکیت ہے۔ بڑے ہارون یعنی یوسف ہارون آج کل نیویارک میں مقیم ہیں، وہ امریکی ادارے انٹرنیشنل انوسٹ منٹ کارپوریشن کے شعبہ مشرق وسطےٰ اور جنوب مشرقی ایشیا کے نائب صدر ہیں، یہ ادارہ کسی ایشیائی ملک میں سرمایہ نہیں لگاتا۔ امریکی ہتھیار اسمگل کرتا ہے، ایشیا میں اسرائیل اس کا مرکز ہے۔ جہاں سے دوسرے ممالک کو ہتھیار پہنچائے جاتے ہیں بھارت ان ہتھیاروں کا سب سے بڑا گاہک ہے، ہارون برادرز کا تجارتی رابطہ سوویت یونین سے بھی ہے۔ اور یہ رابطہ اتنا گہرا ہے کہ سیاسی رشتہ بن گیا ہے۔

ہارون نمبر ۲ یعنی محمود ہارون ان دنوں یورپ کی سیر کرتے ہیں، لندن ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ شیخ مجیب جب لندن گئے تو سننے میں آیا کہ محمود ہارون کی ان سے خفیہ ملاقات ہوئی۔ کیا راز و نیاز ہوئے۔ اس کا علم نہیں لیکن ارادے خطرناک ہیں۔ اس کا اندازہ "ڈان" کی موجودہ روش سے ہوتا ہے۔ ہارون برادرز کی نمائندگی پاکستان میں اب الطاف گوہر کرتے ہیں، ایوب آمریت کے دور میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ بلکہ سننے میں آیا ہے کہ آخری دنوں میں ایوب خان کی عقل کی کنجی ان کی جیب میں رہتی تھی۔ ان ہی کے مشورے پر یوسف ہارون کو جو عرصہ دراز سے معتوب تھے۔ نیویارک سے پاکستان بلایا گیا۔ مغربی پاکستان کا گورنر بنایا گیا۔ منصوبہ تو انہیں صدر پاکستان بنانے کا تھا۔ مگر عوامی جدوجہد نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔

یحییٰ خان کا دور آیا تو الطاف گوہر نے قدرت اللہ شہاب کو جلا وطن کرایا۔ اپنے لئے میدان صاف کیا۔ بڑا ہو جنرل رانی کا کہ اس نے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ رانی رشتے میں گوہر کی غالباً چچا زاد بہن ہے۔ گجرات کی ایک مشترکہ جائیداد پر دونوں کا جھگڑا ہے۔ اور یہی جھگڑا گوہر کے زوال کا باعث بنا، ۳۰۳ کے چکر میں آئے۔ اور ملازمت سے برطرف ہوئے۔ یہ کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ یعنی راتوں رات نوکر شاہی کے افسر سے صحافی افسر قرار پائے۔ ڈان کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہ صحافت کا المیہ ہے۔ پاکستان کا المیہ ہے اب یہ جمہوریت کے نام پر جمہوریت کے قتل کی سازشیں کرتے ہیں اصغر خان سے چھپ کر انٹر کانٹی نینٹل میں ملتے ہیں نواب اکبر خان بگٹی سے سندھ کلب میں راز و نیاز کرتے ہیں اور بوٹ کلب میں ترمیم پسندوں سے طویل مذاکرات کرتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے خفیہ جلسوں میں مشیر کا کردار ادا کرتے ہیں اور اقتدار سے محروم جاگیرداروں کو "راہ عمل" سمجھاتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے ایک تنخواہ دار صحافی جو پہلے پریس ٹرسٹ کے ایک اخبار کے ذریعے جماعت کی تشہیر اور تبلیغ کرتے تھے اب الطاف گوہر کے رفیق کار ہیں اور جماعت کو ان کے قریب لانے میں افسر رابطہ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ صحافی سرمایہ داروں کی حمایت میں اپنے قلم کے جوہر دکھاتے ہیں۔ داد وصول کرتے ہیں اور منہ مانگا انعام و اکرام پاتے ہیں۔

اس سیاسی محاذ کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے ملک میں انتشار پھیلانا، پیپلز پارٹی پر سیاسی دباؤ ڈالنا، اسے عوام سے دور کرنا، جمہوری قوتوں کو کمزور کرنا۔ پیپلز پارٹی کے لئے یہ آزمائش کا وقت ہے۔ وہ اپنی بعض غلط پالیسیوں سے عوام دشمن قوتوں کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہے۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی اس بلیک میلنگ کے جال میں الجھ رہی ہے۔ اس کی واضح مثال لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ، داؤد اور ولیکا کی رہائی ہے۔ جب سرمایہ داروں کے ان نمائندوں کو گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا تھا تو عوام نے مسرت کا اظہار کیا تھا۔ محنت کشوں نے سوچا تھا کہ ان کی محنت کا استحصال کرنے والوں، ان کا

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد: ۔ ۲ شمارہ: ۔ ۳۷

۲۷ جنوری - ۳ فروری سنہ ۷۲ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونینِ خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت
وہاب صدیقی - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

سرورق: انور سمیع

	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
بدلِ اشتراک	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت: - ۶۰ فلس دوبئی قطر: ۷۵ درم
سعودی عرب: ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
پی، ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر: - ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

عکاس: الطاف رانا

خون چوسنے والے سرمایہ داروں کے احتساب کا وقت آ گیا ہے۔ اب حالات سازگار ہوں گے، جمہوریت کا بول بالا ہوگا، مزدور کو معاشرے میں اس کا صحیح مقام حاصل ہوگا۔ اسے زندگی کی بنیادی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ مگر یہ خواب ہنوز شرمندہ تعبیر تھا کہ حالات کا رخ بدلنے لگا۔ محنت کش عوام یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس مرحلے پر جب بیرونی زر مبادلہ حکومت کے اصرار اور انتباہ کے باوجود واپس نہ آیا۔ سرمایہ دار اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہے۔ مزدوروں کے حالات پوری طرح سدھرنے نہیں پائے۔ ان سرمایہ داروں کی رہائی یقیناً حیرت انگیز ہے۔ ہم اس مرحلے پر پیپلز پارٹی پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قوت کا اصل سرچشمہ عوام اور صرف عوام ہیں۔ سرمایہ دار، جاگیردار اور نوکر شاہی نہیں ہیں پیپلز پارٹی کو صرف اور صرف محنت کش عوام پر انحصار کرنا چاہیئے اس لئے کہ محنت کش عوام استحصالی قوتوں سے نمٹنا بھی جانتے ہیں اور ان کے ہتھکنڈوں کو ناکام بنانا بھی جانتے ہیں۔ وہ بیرونی قوتوں کا منہ توڑ جواب بھی دے سکتے ہیں اور سازشوں کے خلاف ملک کا دفاع بھی کر سکتے ہیں۔ اسے طاقت ور بھی بنا سکتے ہیں، اسے استحکام بھی بخش سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اُسے عوام اور صرف عوام کی حمایت اور تعاون سے اقتدار حاصل ہوا ہے۔ اور یہ اقتدار عوام کی امانت ہے۔

احتسابی عمل

کراچی میں ایک اسائیکلو اسٹائل پمفلٹ پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے تقسیم کیا ہے اسے چوری چھپے اپنے آدمیوں تک پہنچایا گیا۔ اس میں ان لوگوں کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ جو پیپلز پارٹی کے اقتدار کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کر رہے ہیں، جن کا وجود پارٹی کے لئے جلد ہی سیاہ دھبہ بن جائے گا۔ اس پمفلٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس صورت حال پر کراچی سے تقریباً ۶۳ علاقائی دفاتر کے عہدیداروں نے غور کیا اور پارٹی کی ہائی کمان کو دہائی دی ہے کہ انہیں سمجھاؤ، باز رکھو، یہ حضرات لگام چاہتے ہیں۔

کارکنوں کی جانب سے یہ احتسابی عمل قابل تعریف ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی سے بے لوث، بے غرض اور جانثار کارکنوں کی دلی وابستگی کا مظہر ہے۔ قیادت کے فقدان کو دور کرنے کی جانب ایک مثبت قدم ہے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ پمفلٹ ہائی کمان تک بھی پہنچ گیا ہوگا۔ وہ یقیناً خوش ہوں گے کہ خلاء پُر ہو رہا ہے۔

کراچی دائیں بازو کے موقع پرستوں اور بائیں بازو کے انتہا پسندوں کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ انہوں نے عروس البلاد میں پوری طاقت اور منظم طور پر منفی کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے صدر مملکت کے مشیر امور عامہ جناب معراج محمد خان نے پورا زور لگا دیا ہے۔ وہ دن رات صنعتی علاقے میں مزدوروں کے مطالبات منوانے، بے چینی اور اضطراب ختم کرانے، ہڑتالیوں اور مالکان کی جانب سے دانستہ طور پر گورنر سندھ کے احکامات کی خلاف ورزی اور تالہ بندی سے پیدا ہونے والے حالات سے نتیجہ آزمائی میں مصروف ہیں۔ وہ تمام معاملات اپنے طور پر حل کر رہے ہیں۔ رکشاؤں اور ٹیکسیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اس عالم میں ایک نعرہ پوری تھکن اُتار دیتا ہے اور وہ ہے، مزدوروں کی آن، معراج محمد خان" جہاں معراج جاتے ہیں، بدامنی کے شعلے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اور مزدوروں کے چہروں پر فتح کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

ایک طرف معراج صاحب ہیں اور دوسری طرف وہ "قائدین" ہیں۔ جن کے بارے میں ۶۳ علاقائی دفاتر کے عہدیداروں نے پمفلٹ شائع کیا ہے۔ اچھا ہو گا کہ یہ "قائدین" وقت کے تقاضوں کو پورا کریں۔ دائیں بازو کے موقع پرستوں اور بائیں بازو کے انتہا پسندوں کی چالوں کی روشنی میں اپنی ذمہ داریاں پوری کریں ورنہ اُس عتاب سے ڈریں جو عوام کے محاسبے کی صورت میں نازل ہو گا۔ ہم مصلحتاً ان کے کارناموں پر روشنی ڈالنے سے گریز کر رہے ہیں۔ ورنہ وہ جان لیں کہ ہمیں بھی یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ ہم عوام کی جانب سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو پورا کریں اور اندرونی دشمنوں پر بھرپور وار کریں۔

"الفتح" کے دفتر میں ٹیلیفون لگ گیا ہے جس کا نمبر ۲۲۷۴۱۴ ہے

غیر ملکی زرمبادلہ

بیرونی زرمبادلہ کے قومی جرم میں حکومت اور سیاستدان برابر کے شریک رہے ہیں

سوئیزرلینڈ اور لبنان میں

پاکستانی سرمایہ داروں کا چالیس ارب روپیہ جمع ہے

ارشاد راؤ

پاکستان کے سرمایہ داروں نے تقریباً ۴۰ ارب روپے کا زرمبادلہ سوئیزرلینڈ اور لبنان کے پراسرار بنکوں میں جمع کر رکھا ہے ملک کے ان بدترین دشمنوں نے ابھی تک صرف چار کروڑ روپے کی مالیت کے زرمبادلہ کا اعلان کیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس سرمایے کی تفصیلات عوام تک پہنچانے کے لئے ملک کے تمام اخبارات بشمول نیشنل پریس ٹرسٹ انتہائی مکارانہ اور عیارانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ سرمایہ داروں کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے۔ ان کا رویہ سرمایہ داروں سے مختلف نہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملک دشمنی میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔

ہم اپنا فرض پورا کرنے میں پہل کر رہے ہیں ہمیں یہ تفصیلات حاصل کرنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ اس راز کو فاش کرنے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوا۔ ہوا یوں ہے کہ گذشتہ پندرہ سال سے حکومتیں اپنے کارندوں اور سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کے ذریعے زرمبادلہ غیر ممالک کو منتقل کرتی رہیں۔ ان میں کوئی بھی حکومت براہِ راست پارٹی نہ تھی لیکن اقتدار پر قبضہ کرنے والے اس میں ایک اہم فریق کے طور پر کام کرتے رہے۔ ان قابضین اقتدار کی نمائندگی پلاننگ ڈیپارٹمنٹ، پک اِک اور صنعتی ترقیاتی بنک نے کی جب کہ سرمایہ داروں میں بدنام زمانہ ۲۲ خاندان بلاشراکت غیرے سیاست دان باشراکت سرمایہ داران شامل تھے۔

غیر ممالک جن میں امریکہ، برطانیہ اور جاپان سرفہرست ہیں نے پاکستان کو جو قرضے دیئے۔ وہ تمام پک اک نامی ایک سرکاری ادارے اور صنعتی ترقیاتی بنک کے ذریعے تقسیم ہوتے۔ ہوتا یہ تھا کہ حکومت پنج سالہ منصوبوں کا اعلان کرتی تو صدروں، وزیروں اور ان جیسے اختیارات رکھنے والے حاکموں کے منظورِ نظر سرمایہ دار حرکت میں آجاتے۔ یہ قرضے صرف ان افراد کو ملتے جنہیں ان بااختیار شخصیات کی منظوری مل جاتی تھی۔

غضب یہ ہوا کہ جن مغربی ممالک نے قرضے دیئے۔ انہوں نے پابندی لگائی کہ مشینیں ان کے ہاں سے خریدی جائیں۔ صرف سوشلسٹ ممالک نے رعایت برتی کہ وہ جہاں سے چاہیں مال خرید لیں۔ پہلا قرض "ٹائیڈ" اور دوسرا قرض "ان ٹائیڈ" کہلایا۔ تاہم ان قرضوں کی الاٹ منٹ حکومت پاکستان کرتی تھی۔ جن سرمایہ داروں کو قرض درکار ہوتا تھا، وہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحات کا "فیزیبلٹی پلان" بناتے۔ ان میں ان صنعتوں کے لئے قرض مانگا جاتا تھا۔ جن کا پنج سالہ منصوبوں میں ذکر ہوتا تھا۔ مثلاً ایک پلان میں ۴۴ ٹیکسٹائل ملوں کا منصوبہ شامل ہے۔ دل چسپی رکھنے والے سرمایہ داران کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے۔ صدر، وزیر اعظم اور گورنران کا فیصلہ کرتے۔ ان کو عوام کو بھی مطمئن کرنا ہوتا تھا کہ وہ اُن کا زر کے خلاف عوامی ردِ عمل کو ٹھنڈا کریں۔ اس صورت میں بائیس خاندانوں کے علاوہ "نوواردوں" کی اصطلاح پیش کی گئی۔ ۶۶ء کی بات ہے کہ حکومت کو ۴۴ ملیں قائم کرنا تھیں۔ بڑے صنعتکاروں کا پیٹ بھرنے کے بعد نوواردوں کا قرعہ بیگم زاہدہ خلیق الزماں اور عبدالوحید خاں کے نام نکلا۔ دونوں ایوب خان کے وزیر تھے انہیں پرمٹ مل گئے۔

پرمٹوں کی وصولی اور پلان کی منظوری کے بعد غیر ملکی قرضے کے زرمبادلہ کا مرحلہ آتا تھا۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ جس منصوبے کے لئے سو پونڈ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے لئے قرض مانگنے والے کو ۲۵ پونڈ کا ذاتی بنک سرٹیفیکیٹ یا اس کے مساوی مالیت کے اثاثے کا سرٹیفیکیٹ جمع کرانا پڑتا تھا۔ یہ صرف دکھاوا تھا ورنہ غیر ممالک نے اپنی مشینوں کی جو فہرستیں پاکستانی سرمایہ داروں کے پاس بھیجی ہوتی تھیں، ان پر جھوٹی قیمتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک مشین کی اصل قیمت سو پونڈ ہے۔ لیکن فہرست میں اس کی قیمت ایک سو بیس پونڈ درج ہوتی تھی۔ حکومت بھی ان فہرستوں کی روشنی میں پاکستانی صنعت کاروں کو زرمبادلہ فراہم کرتی۔ اس طرح غیر ملکی سرمایہ دار اور حکومت جھوٹی قیمت کے ذریعے اپنے ملک کا سو میں سے بیس پونڈ بچاتا اور دوسرے اسے وہ کام بھی کرنا ہوتا جو اس پورے مضمون کی جان ہے۔

خریداری اور کمیشن

اب پاکستانی صنعت کار ایک سو بیس پونڈ کی منظوری لے کر متعلقہ ملک پہنچتا۔ وہاں غیر ملکی سیٹھ جس سے اُسے مشین خریدنا ہوتی تھی۔ پوچھتا کہ چھپی ہوئی قیمت میں سے اسے کیا ملے گا۔ برسوں سے یہ مسلمہ پریکٹس رہی ہے کہ پاکستانی سرمایہ داروں کو کم از کم پندرہ فی صد کمیشن چھپی ہوئی قیمت پر ملتا اور سودا بہت ہی بڑا ہوتا تو نسبتاً کم یا زیادہ کمیشن مل جاتا۔ کم اس صورت میں ملتا کہ بڑے سودے میں غیر ملکی سرمایہ دار کو اپنے حکام کو بھی رشوت دینا پڑتی تھی۔ اور وہ رقم پاکستانی سرمایہ دار کے کمیشن میں سے کاٹ لی جاتی تھی۔

مختصر یہ کہ پاکستانی صنعت کاروں کو ۱۵ اور ۲۰ فی صد کمیشن ہر صورت میں ملتا تھا۔ وہ یہ رقم کسی محفوظ مغربی بنک میں جمع کروا دیتے تھے اور اس طرح پاکستانی عوام کو مشینوں کی اصل قیمت کے علاوہ پاکستانی سرمایہ داروں کی اس غیر ملکی دولت کو بھی ادا کرنا پڑا۔

نیوز ویک نے اپنی ایک اشاعت میں اس کالے زرمبادلہ کی مالیت ۵۰ کروڑ ڈالر بتائی ہے۔ نیوز ویک کے سامنے بھی یہی اعداد و شمار ہوں گے۔ لیکن نیوز ویک سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے پاکستان کو غیر ملکی مشینری مہیا کرنے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل نہیں کیں۔ کیونکہ اس کے ذرائع صرف بڑے قرضوں تک محدود رہے۔ جب کہ پاکستان کو امریکہ کے علاوہ جاپان، برطانیہ، مغربی جرمنی اور دوسرے ممالک نے بھی قرضے دیئے حکومت پاکستان نے بھی براہ راست غیر ملکی قرضے جاری کئے اور سرکاری افسروں نے زرمبادلہ میں سے کمیشن وصول کیا۔ یہ

سرمایہ دار ہر سال غیر ممالک میں پاکستانی حاکموں پر چار لاکھ ڈالر خرچ کرتے ہیں

رقم وہ آج بھی جب چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔

کالے زرمبادلہ کو غیر ممالک میں جمع کرانے کا کام گزشتہ پندرہ سالوں سے جاری ہے۔ اس کے بارے میں صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ اصول رکھا جائے کہ غیر سوشلسٹ ملکوں سے (سوشلسٹ ملکوں میں کمیشن نہیں چلتا) جو مشینری قرضوں پر درآمد کی گئی ہے اس پر کم از کم ۱۰ فی صد کمیشن پاکستانی سرمایہ داروں کو ملا ہے۔ یہ اندازہ حقیقت سے قریب ترین ہوگا۔ درآمد شدہ مشینری کی لاگت حکومت کے ریکارڈ میں محفوظ ہوگی۔ درآمد کرنے والے صنعت کاروں کے نام پتے اور مشینری سے متعلق تفصیلات وزارت صنعت و تجارت سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

کالا زرمبادلہ خرچ بھی ہوتا ہے۔ غیر ممالک کو جانیوالے صنعت کار کالے زرمبادلہ سے نہ صرف اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں بلکہ وہ حکمران جنہوں نے یہ زرمبادلہ فراہم کیا ہے۔ ان کے غیر ملکی اخراجات اور عیاشیوں کا سامان بھی اسی میں سے نکالا جاتا ہے۔ سابق صدر ایوب کی کابینہ کا شاید ہی کوئی ایسا رکن ہو گا جو اس زرمبادلہ سے فیض یاب نہ ہوا ہو۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کالے زرمبادلہ میں سے ہر سال چار لاکھ پونڈ خرچ ہوتے ہیں۔

غیر ممالک میں کالے زرمبادلہ کے تین مصرف ہیں۔

(۱) غیر ممالک میں مقامی شراکت سے کاروبار کرنا اور اس کا نفع بھی باہر رکھنا۔

(۲) اس زرمبادلہ کا کچھ حصہ بوقت ضرورت ناجائز طریقے سے پاکستان میں لے آنا جس سے پاکستانی روپے کی قیمت گرتی رہی ہے۔

(۳) اسے سوئٹزرلینڈ وغیرہ کے بنکوں میں محفوظ رکھنا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ پہلا مصرف سیدھا سادا ہے۔ غیر ممالک میں کاروبار وہی صنعت کار کرتے ہیں جو پاکستان کی غیر یقینی معیشت پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ روپیہ پاکستان کا ہے۔ لیکن وہ اندرا گاندھی کی طرح پاکستان کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتے۔

دوسرا طریقہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ جو ایجنسیاں یا بنک صنعت لگانے والے پاکستانی درخواست گزاروں کو اجازت دیتے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ درخواست دینے والا خود بھی کچھ روپیہ لگا سکتا ہے یا نہیں۔ اسے سرمایہ کاری کی اصطلاح میں شرکت سرمایہ کاری کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر سو روپے کا قرض چاہیئے تو قرض دینے والی ایجنسی یہ جانتی ہے کہ کیا آپ کے پاس اپنے پچیس روپے بھی ہیں۔ کیونکہ آپ کا کوئی پیسہ بھی نہیں تو پھر آپ دوسرے کے مال کو نہ پوری توجہ کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں اور نہ محنت کر سکتے ہیں۔ اس لئے وہ اصرار کرتے ہیں کہ کچھ سرمایہ آپ کا بھی ہو۔ پاکستان میں نودولتیوں کے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور حکومت اجارہ داریاں پیدا کرنے کے الزام کے تحت شدید ردعمل کو دھوکہ دینا چاہتی تھی۔ لہذا نواردوں کی اصطلاح رائج کی گئی۔ بڑی بڑی صنعتوں میں تو اجارہ داریاں چلتی رہیں گی لیکن نسبتاً چھوٹی صنعتوں میں، اور ان صنعتوں میں جن میں پھیلاؤ ضروری تھا (مثلاً ٹیکسٹائل) کچھ نام نہاد نئے صنعت کار ہمت افزائی کے مستحق قرار پائے۔ یہ تمام حکمرانوں کے رشتہ دار، سیاسی ایجنٹ اور نام نہاد بزرگ سیاست دان تھے حکومت کے ایما پر بنکوں نے جعلی سرٹیفیکیٹ جاری کئے یہ لوگ قرضوں کا اجازت نامہ لے کر غیر ممالک پہنچے تو وہاں ان میں اوپر بیان کئے ہوئے سسٹم کے مطابق چھپی ہوئی جھوٹی قیمتوں پر ۱۵ فیصد زرمبادلہ پر کمیشن ملا۔ مثال کے طور پر ایک لاکھ پونڈ کے قرضوں پر بیس ہزار پونڈ کمیشن کے بن گئے۔ پونڈ کی سرکاری قیمت بارہ روپے ہے، بلیک میں یہ بیس اور پچیس روپے میں ملتا ہے، چنانچہ یہ تو دو لینے کرنسی کا بین الاقوامی کاروبار کرنے والی ایجنسیوں کے ذریعے اپنے کمیشن کی رقم پاکستانی کرنسی میں واپس لے آئے اور اس طرح سے انہیں جہاں قرض پر ملز مل گئی وہاں لاکھوں روپے کا کالا زرمبادلہ پاکستان کی مارکیٹ میں شامل ہو گیا۔ یہ کاروبار وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔

تیسرا مصرف ایک بین الاقوامی ایکٹ سے ہے دنیا کے چند ملکوں میں، جن میں لبنان اور سوئٹزرلینڈ بطور خاص قابل ذکر انکے قوانین بنے ہوئے ہیں جنکی رو سے کوئی حکومت کسی حالت میں اپنے بنکوں سے راز نہیں معلوم کر سکتی۔ ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ ان ممالک کی تمام تر اقتصادی حالت کا دارومدار ان بنکوں پر ہے اور اس طرح یہ حکومتیں بنکوں کے ذریعے چلتی ہیں۔

پُراسرار بنک

سوئٹزرلینڈ اور لبنان کے ان بنکوں میں دنیا بھر کے ترقی پذیر ممالک کے صدروں، وزراء، شیوخ اور بڑے صنعت کاروں کے اکاؤنٹنٹ ہیں۔ ان کے سود کی شرح بہت کم ہے۔ بعض بنکوں میں سود دیا ہی نہیں جاتا۔ اور وہ صرف رقم کو محفوظ رکھنے کا کام کرتے ہیں۔ بعض الٹا معاوضہ لیتے ہیں۔ ان اکاؤنٹس کا حساب نمبر چار درجوں میں خفیہ سے خفیہ تر کر دیا جاتا ہے اسے کوڈ نمبر سسٹم کہتے ہیں۔ عام طور پر اکاونٹ والے کا اصل نام نہیں لکھا جاتا بلکہ اس کی مرضی کا عدد دیدیا جاتا ہے یا کوئی فرضی نام لکھا جاتا ہے تاہم اس کی تصویر اس میں محفوظ کی جاتی ہے اور ایک مقررہ وقفہ کے بعد وہ تصویر بدلی جاتی ہے۔ اکاونٹ رکھنے والا چاہے تو وہ اپنے بچوں یا بیوی یا کسی با اعتماد آدمی کی تصویر بھی محفوظ کرا دیتا ہے اس سسٹم میں بنک نہ کوئی چیک جاری کرتا ہے اور نہ بنک اکاونٹ کی تفصیل بھیجتا ہے۔ یہ بنک حساب رکھنے والے سے کسی قسم کی خط و کتابت بھی نہیں کرتے تاہم کچھ بنکوں میں ۲۵ برس تک اکاونٹ ہولڈر بنک سے رابطہ قائم نہ کرے تو وہ رقم بحق بنک ضبط کر لی جاتی ہے۔ کچھ بنکوں میں یہ مدت پچاس برس بھی ہے۔

ان حالات کی روشنی میں حکومت پاکستان کے پاس ایک ہی فارمولا رہ جاتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے درآمد شدہ مشینری کی قیمت کا کم از کم دس فیصد حصہ بصورت زرمبادلہ ظاہر نہیں کیا۔ انہیں بلا تاخیر بمعہ اہل خاندان عزیز و اقارب اور ان افسروں کے جنہوں نے یہ قرضے جاری کئے تھے۔ ان کی تمام جائیدادیں ضبط کر لیں ان لوگوں کو جیل میں بند کرکے پہلے کوڑوں کی سزائیں دی جائیں اس پر بھی راز نہ کھلیں تو ایک ایک کرکے پھانسی پر لٹکا دیا جائے اس سے نہ صرف اس خفیہ زرمبادلہ کا انکشاف ہوگا۔ بلکہ آئندہ جھوٹی قیمتوں پر کمیشن وصول کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔

حبیب بنک کا منافع

حبیب بنک کا منافع ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۱ء تک ایک کروڑ ۹۰ لاکھ روپے ٹیکس کی ادائیگی کے بعد دو کروڑ ۲۷ لاکھ ۲۵ ہزار نو سو دو روپے رہا۔ گذشتہ سال کی قابل تقسیم رقم ۱۱ لاکھ ۹۲ ہزار ۴۶۸ ملا کر اب یہ رقم دو کروڑ ۳۹ لاکھ ۱۸ ہزار ۳۷۰ تک پہنچ گئی ہے۔ مذکورہ رقم میں سے قومی دفاعی فنڈ میں ۸۲ لاکھ روپے دیئے گئے اور ریزرو فنڈ میں ۴۰ لاکھ روپے منتقل کئے گئے۔ اور عبوری منافع کی رقم ۷۷ لاکھ ۴۰ ہزار روپے رہی

بحری وڈیرے ——— پردہ چاک



مظفر حسن

نیشنل شِپنگ کارپوریشن کی طرف سے لاکھوں روپے کی مالیتی کار یحییٰ خان کو تحفۃً پیش کی گئی

ایک ایڈمرل کے حِصّے میں ایک جہاز بھی نہیں آتا تھا

اشرف شاد

فوجی وڈیرے اور اب — بحری وڈیرے

پاکستان کی تباہی کا مرکزی کردار کون تھا۔ یحییٰ خان اس کے بعد لیفٹیننٹ جنرل، یا وہ نظام جس کی وہ پیداوار تھے، جس کا انہیں رکھوالا بنایا گیا تھا — لیکن مرکزی کردار کے اس بھیڑ میں بہت سے چہرے نظر انداز بھی ہوئے ہیں۔ نیوی کو ہم نے ایک عوضِ معطل سمجھ کر کبھی زیرِ بحث لانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک یوائے سعید زیرِ بحث آیا لیکن صرف یحییٰ خان کے دلال کی حیثیت سے — نیوی کا کردار مجموعی حیثیت سے زیرِ نظر نہیں آیا۔ کسی نے اس جانب توجہ نہیں کی کہ نیوی سمندر کی رانی بنی ہوئی کس دھن پر رقص کر رہی ہے دسمبر ۱۹۷۱ء کے المیہ نے بہت سے جسم عریاں کئے، اس وقت بھی نیوی کے وڈیروں کی وردی نہیں اُتری۔ لیکن جب افواج کی تطہیر شروع ہوئی تو بہت سے ایڈمرل، کموڈور اور کمانڈر بھی زد میں آئے اور پھر بہت سی کہانیوں سے پردہ سرکا۔

لیکن یہ پردہ بڑی آہستگی سے سرکا ہے۔ اسے آتار کر ابھی تک کسی نے نہیں پھینکا۔ ورنہ اسی نیوی نے کتنے یوائے سعید سامنے آتے نیوی کا یہ پردہ بھی آج ہم چاک کئے دیتے ہیں۔

یوائے سعید بحری وڈیروں کے اس ڈرامہ کا مرکزی کردار ہے۔ یحییٰ خان کے زمانے میں پوری نیوی اس کے ہاتھوں اس انجام کو پہنچی کہ ہم پانی میں بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہے ۱۹۴۷ء سے مارچ ۱۹۶۹ء تک پوری بحریہ میں ایڈمرل کا صرف ایک عہدہ ہوتا تھا۔ لیکن یحییٰ خان کی تاجپوشی ہوتے ہی تمام بدعنوان افسروں کے لئے ترقی کے دروازے کھل گئے اور پھر بہت جلد ہی سات افسروں کو ایڈمرل بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر کموڈور بنائے گئے نیوی میں کموڈوروں کی کل تعداد ۵۲ تھی۔ بحریہ میں جہازوں کی صورت حال یہ تھی کہ ایک ایڈمرل کے حصّے میں ایک جہاز بھی نہیں آتا تھا۔ یہ ساری ترقیاں یوائے سعید کے اشارے پر ہوئی تھیں اس کے اشارے میں بڑی برکت تھی۔ ان اشاروں پر سینڈز پٹ کے کنارے شہر بھر کی حسین لڑکیاں رقص کرتی تھیں۔ اور یحییٰ خان انڈر ویر پہنے ان کے درمیان جھوما کرتے تھے۔

نیوی کے سارے بدعنوان افسروں کی ترقی کا راز یوائے سعید کے اشارے پر ہے جن پر یحییٰ خان کے دستخطوں سے ترقی کے پروانے گھوما کرتے تھے۔ یوائے سعید کے پاس پورے نیشنل شپنگ کارپوریشن کا فنڈ تھا۔ جسے وہ اپنے انہیں اشاروں کو مزید تیز رفتار بنانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے نیشنل شپنگ کارپوریشن میں کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ بڑے دلچسپ ہیں اور ذرا تفصیلی تذکرے کا تقاضا کرتے ہیں۔

یوائے سعید

یحییٰ خان کے لئے سینڈز پٹ کے ساحل پر راتوں کو رنگین بنانے کے بارے میں وہ جو اہتمام کیا کرتے تھے اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس کے علاوہ یحییٰ خان کے لئے

ایک بریگیڈیئر کی عیاشی کے لئے پورا جہاز وقف کردیا گیا



ایم کے لودھی



رشید احمد

انہوں نے اور بھی بہت کچھ کیا۔ مرسڈیز چھ سو ماڈل کی کار سربراہانِ مملکت کے لئے خاص طور پر بنائی گئی ہے اسے خاص طور پر آرڈر دے کر تیار کیا جاتا ہے۔ لاکھوں روپے کی مالیت کی یہ کار پوری دنیا میں صرف آٹھ سربراہانِ مملکت کے پاس ہے یو اے سعید نے یحییٰ خان کے لئے خاص طور پر آرڈر دے کر تیار کرائی اور پھر نیشنل شپنگ کارپوریشن کے ایک جہاز میں کراچی لائی گئی اور یحییٰ خان کو تحفہ میں پیش کی گئی۔ یہ کار یحییٰ خان نے اپنی بیوی کے استعمال کے لئے وقف کردی تھی۔ تاکہ ان کی بیگم اس کی آرام دہ کوچ پر بیٹھ کر



یو اے سعید

یحییٰ خان کی سرگرمیوں کے بارے میں لاعلم ہو جائیں۔ یو اے سعید نے صرف یحییٰ خان کو ہی فیض نہیں پہنچایا بلکہ ان کے دوستوں کے لئے بھی ان کے (یعنی نیشنل شپنگ کارپوریشن کے) دروازے کھلے ہوئے تھے۔ یحییٰ خان کے ایک دوست بریگیڈیر سلطان کو سنگاپور تفریح کے لئے جانا تھا۔ یو اے سعید کو ان کے اس تفریحی دورے کا اہتمام کرنے کے لئے کہا گیا۔ یو اے سعید نے کارپوریشن کا ایک مال بردار جہاز ایم وی راوی ان کے لئے وقف کردیا۔ یہ جہاز ضروری برآمدی مال لے کر جا رہا تھا لیکن اس جہاز پر یحییٰ خان کے اس بریگیڈیر دوست کے لئے عیاشی کے تمام سامان فراہم کئے گئے۔ یہ جہاز سنگاپور پہنچا تو بریگیڈیر صاحب یہاں تفریح کرتے رہے اور ان کی عیاشی کے ایام پورے ہونے تک جہاز کو سنگاپور میں روکے رکھا گیا اور اس طرح برآمد کے لئے جانے والا سامان وقت پر نہ پہنچایا جا سکا، تین روز تک ٹھہرا رہنے کے بعد بالآخر جہاز کو جانے کا حکم ملا اور ایک اور جہاز سے ان کی واپسی کا اہتمام کیا گیا۔ واپسی پر وہ تعیش کا کوئی ایسا سامان نہیں تھا جو اس جہاز پر لاد کر نہ لاتے ہوں۔ یہ سارا سامان کراچی آنے پر بغیر کسی کسٹم چیکنگ اور ڈیوٹی کی ادائیگی کے بندرگاہ سے باہر جانے دیا گیا۔ جہاز کے عملے کے لوگ بھی اپنے ساتھ کچھ سامان لے کر آئے تھے، اس میں سوٹ کے کچھ پیس اور ایسا ہی بہت سا چھوٹا چھوٹا سامان تھا۔ جس پر کسٹم والے بڑی کڑی نگاہ رکھتے ہیں عملے کے ارکان کی درخواست پر بریگیڈیر صاحب ان کا سامان بھی باہر نکال کر لے گئے۔ لیکن دوسرے روز عملے کے ملازمین ان سے جب اپنا سامان لینے پہنچے تو انہیں یہ کہہ کر بھگا دیا گیا کہ تم لوگ اسمگلنگ کرتے ہو بھاگ جاؤ ورنہ پکڑوا دیا جائے گا۔

نیشنل شپنگ کارپوریشن میں یو اے سعید کا یہ ایکٹ صرف تنہا اس کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ یہاں کے ہر بڑے عہدے پر اس نے نیوی کے مختلف افسروں کو ریٹائر کر کے ڈیپوٹیشن

پیرے کر اپنے جال کو مضبوط کیا اور ایسے سارے افسروں کو بری طرح پریشان کیا گیا جو کسی قدر بھی قومی جذبہ رکھتے تھے۔ کیپٹن اے آر صدیقی فنانس منیجر تھے اسٹور کے بھی انچارج تھے لیکن ایماندار آدمی تھے اور بوائے سعید ان کے ذریعے گھپلے کرنے میں کچھ دقت محسوس کرتا تھا۔ لہٰذا ایک علیحدہ اسٹور ڈیپارٹمنٹ کھولا گیا اور نیوی کے ایک کیپٹن آئی اے لطیف کو منیجر اسٹور مقرر کیا گیا۔ پھر اسی کے ذریعے بوائے سعید نے مختلف ٹھیکیداروں کے ذریعے بڑے پیمانے پر کارپوریشن کے فنڈز کو خرد برد کیا۔ شیریں قادر کے باپ قادر کو خصوصاً بہت نوازا گیا اور اس کے ذریعے اتنے بڑے پیمانے پر ملک کا زرمبادلہ ضائع کیا گیا کہ یہ ایک بھیانک قومی جرم بن گیا۔ شیریں قادر کے باپ نے لندن میں قادرز ذی 'KADER'S' کے نام سے ایک کمپنی قائم کی اور وہاں وہ نیشنل شپنگ کارپوریشن کے پہنچنے والے جہازوں پر سامان سپلائی کرتا تھا۔ اس سامان کے عوض وہ ایک پونڈ کے سامان کی قیمت کئی پونڈ وصول کرتا رہا۔ وہاں اس نے کچھ فلیٹ کرائے پر لئے تھے، جسے جہازوں کے کیپٹن عیاشی کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ عیاشی کا سارا ساز و سامان قادر کی طرف سے فراہم ہوتا تھا۔ اس نے اس فرم کے نام پر اسٹرلنگ پونڈ کی شکل میں لاکھوں پونڈ وصول کئے۔ اس کے خلاف جب زیادہ شکایتیں ہوئیں تو اس وقت کے فنانس منیجر کیپٹن اے آر صدیقی مرحوم نے اس کے خلاف انکوائری کرنے کے احکامات دیئے اور ساری ادائیگیاں روک دیں۔ لیکن فوری طور پر نئے اسٹور منیجر کیپٹن لطیف نے اسٹور کا سارا چارج سنبھال لیا۔ ان کے آتے ہی انکوائری کی فائل دبا دی گئی تمام ادائیگیاں کر دی گئیں اور اس طرح لاکھوں اسٹرلنگ پونڈ قومی ادارے کے فنڈ سے ادا کر دیئے گئے۔ قادرز اب بھی این ایس سی کا ٹھیکیدار ہے، جہازوں کے فاضل پرزہ جات کی فراہمی اور ایسے ہی کچھ اور ٹھیکے اب بھی اس کے پاس ہے بوائے سعید اور اس کے نامزد کردہ افسران اسے اب بھی پوری طرح تعاون فراہم کرتے ہیں۔

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

کراچی کی بندرگاہ پر روسی جہاز رات بھر سگنل دیتا رہا

نیشنل شپنگ کارپوریشن شپ یارڈ **بحری وڈیروں** نے

انجینئرنگ ورکس، کراچی پورٹ ٹرسٹ اور ڈائریکٹریٹ پورٹس اینڈ شپنگ میں بحریہ کے بدعنوان افسروں نے گھسا کر قومی فنڈ کو جس طرح اپنی ذات پر صرف کیا اور جس طرح ان سے اپنے محل تعمیر کئے۔ اس داستان کے کچھ حصے ہم نے بیان کئے ہیں۔ لیکن اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ خود نیوی میں انہوں نے غداری کے جو نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں اس نے پوری قوم کو ایک ایسے المیئے سے دوچار کیا۔ جس نے پوری قوم کی آنکھوں میں خون کے آنسو بھر دیئے۔ اس سلسلے میں بعض واقعات کا بیان بڑا ضروری ہے تاکہ ان بحری وڈیروں کے اصلی کرتوتوں کو عوامی عدالت میں بھی پیش کیا جاسکے۔

بندرگاہ سے باہر منوڑہ پر ایک روسی جہاز کھڑا تھا۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ رات کو حملے کے وقت روشنی کے سگنل دیتا ہے۔ اور اس طرح بھارتی حملہ آور جہازوں کو پاک بحریہ کے جہازوں کی صحیح پوزیشن معلوم ہوتی رہی۔ یہ ۳ر دسمبر کی بات تھی۔ جس روز مغربی پاکستان پر بھارت حملہ آور ہوا تھا۔ اس کے دوسرے روز ۴ر دسمبر کی رات کو اس جہاز سے غوطہ خوروں کو بھی چھلانگیں لگاتا ہوا بھی دیکھا گیا اور اس کے دوسرے روز ۵ر دسمبر کو یہ جہاز لنگر اٹھا کر باہر چلا گیا۔ پاک بحریہ ہی کے ایک جوان کا بیان ہے کہ راڈار پر ایک جہاز اور دو کشتیوں کے نشانات دکھائی دیتے رہے معلوم ہوا کہ یہ بھارت کی میزائل بردار کشتیاں تھیں۔ پاک بحریہ کے ایک تجربہ کار سپاہی کے بیان کے مطابق یہ کشتیاں تین گھنٹے تک چل سکتی ہیں۔ اور اس کے بعد انہیں کسی بھی جہاز سے تیل لینا ضروری ہوتا ہے۔ پاک بحریہ کے ایک جہاز پر جس کے راڈر پر ان کے نشانات دکھائی دیئے تھے۔ عملے نے جہاز پر متعین افسر سے کہا کہ وہ اگر کوئی کارروائی کا ارادہ نہیں رکھتے تو نیول ہیڈ کوارٹر کو اس کی اطلاع دے دیں۔ لیکن اُس نے اطلاع نہیں دی۔ نتیجتاً یہ بھارتی کشتیاں اطمینان سے گشت کرتی رہیں اور ۵ر دسمبر کو یہ روسی جہاز کراچی سے چلا۔ بحریہ کے جہاز منصف نے نیول ہیڈ کوارٹر کو بتایا اور جہاز روکنے کی کوشش کی۔ لیکن ہیڈ کوارٹر سے حکم ملا کہ جانے دو۔ اور جب یہ جہاز چلا گیا تو سعودی عرب کی دی ہوئی دو کشتیوں "صداقت" اور "رفاقت" کو حکم ملا کہ وہ بھارت کی ان میزائل بردار کشتیوں کو روکیں کیوں ان کی رفتار ۴۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ لیکن "رفاقت" کے چار میں سے دو انجن خراب ہو گئے۔ لہٰذا وہ واپس آگئی۔ جب کہ "صداقت" کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ یہ سب کچھ کس چیز کی نشان دہی کر رہی ہیں۔ جنگ میں دشمن کے جہازوں کو اس طرح گشت پر بلا کر واپس بھیجنے کا یہ سلسلہ —— کس سازش کی کڑی ہے اور اس کڑی کے کنڈے کس کس سے اٹکے ہوتے ہیں ——

اسی طرح لڑاکا بحری جہاز "خیبر" جس وقت حملہ کے نتیجہ میں غرق ہوا ہے اس کے آدمیوں کو تیس گھنٹے بعد "صداقت" کے ذریعے بچایا گیا۔ اگر جہاز کی پوزیشن کا پہلے سے علم ہوتا تو اور بہت سے آدمی بچائے جاسکتے تھے۔ اس جہاز پر مختلف راڈار لگے تھے۔ لیکن حملہ کے وقت تیس میل تک کی رپورٹ دینے والا راڈار چل رہا تھا۔ جب کہ ڈیڑھ سو میل والے راڈار بند تھے —— کیوں؟ اس کا جواب بھی حکومت کی تحقیقات کے بعد ہی مل سکے گا۔ خیبر کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت یہ ڈوب رہا تھا۔ اس کے کیپٹن اور سیکنڈ کمانڈر نے سب سے پہلے جان بچانے کے لئے چھلانگیں لگائی تھیں۔ اور جان بچانے کے بعد کئی دن کسی کو شکل تک نہ دکھائی۔

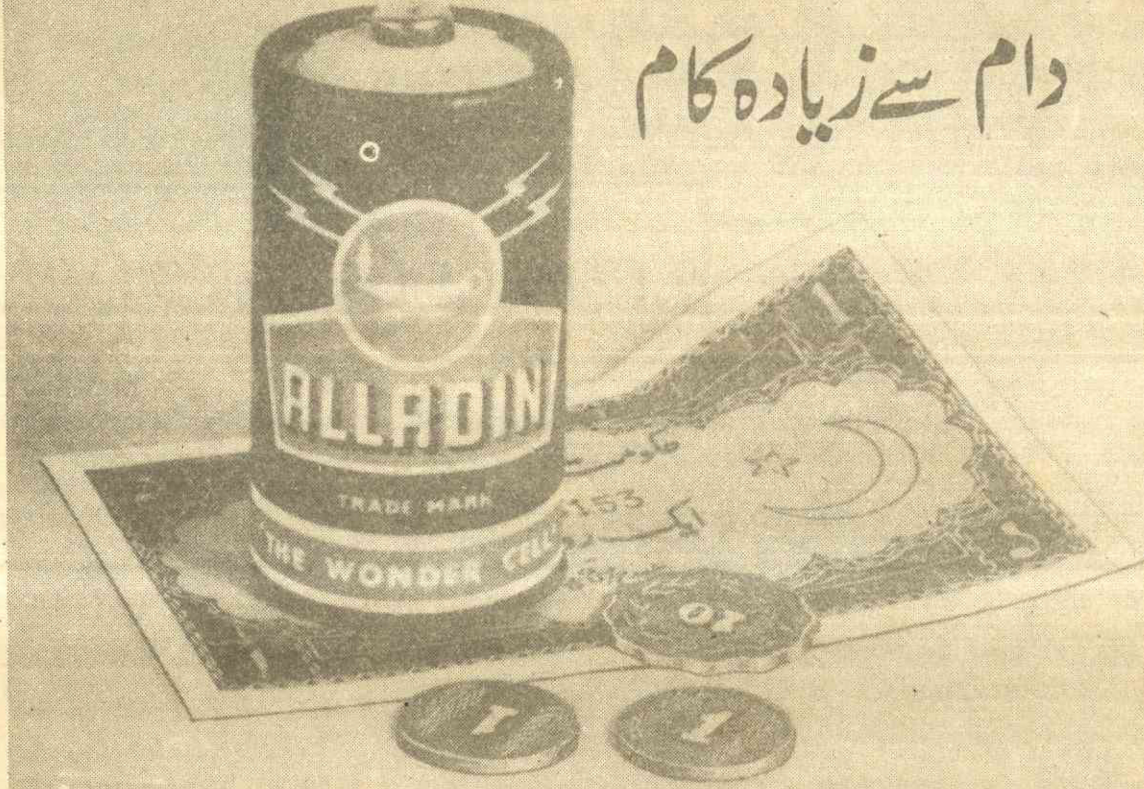
ایک جہاز کو پٹرولنگ پر بھیجا گیا۔ پٹرولنگ پر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا انجن خراب تھا۔ کسی مشین کا پرزہ ٹوٹا ہوا تھا یا کوئی اور گڑبڑ تھی۔ نتیجتاً اس جہاز کو بھارت کے جہازوں کی بمباری کے نتیجے میں تباہ ہونا پڑا۔

بھارت کی میزائل بوٹیں منوڑہ سے صرف پانچ میل دور تک اندر آئیں لیکن قاسم فورٹ سے ان پر کوئی فائرنگ نہیں کی گئی۔

سپلائی کا ایک جہاز "ڈھاکہ" منوڑہ سے باہر تجارتی جہازوں کے درمیان کھڑا تھا۔ ۴ر دسمبر کو اُسے جگہ تبدیل کرنے کا حکم ملا اور جگہ تبدیل کرتے ہی اس پر بھارتی جہازوں کا حملہ ہوا۔

ایسے ہی اور بہت سے کارنامے پاک بحریہ کے "جیالوں" نے انجام دیئے۔ انہیں کب تک اور کہاں تک بیان کیا جائے۔ کیونکہ یہ سب کچھ خود ہماری گردنوں پر ایک بوجھ ہے۔ ہم صرف ان خوش آئند توقعات کے سہارے کھڑے ہیں کہ کب اِن فوجوں سے وڈیروں کو نکال کر انہیں واقعی پاک کیا جائے گا۔

الفتح



سب سے زیادہ چلنے والا

الہ دین سیل

ایٹکو انڈسٹریز۔ ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی

adcom 2075 UR







”عبٹی دھاگہ“ کا اشتہار دیکھ کر وہ جبٹی پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے

یحییٰ خان نے پی آئی اے کے طیارے کو قحبہ خانہ بنا دیا

عیاشی میں نوابزادہ شیر علی اور نواب قزلباش شریکِ سفر تھے

الفتح رپورٹ

میاں محمد طفیل کے مطابق ”اسلامی آئین“ دینے والے صدر یحییٰ کی صدارتی سرگرمیاں رفتہ رفتہ سامنے آ رہی ہیں۔ میاں محمد طفیل کو اگر شرم ہو گی تو اپنے ان بیانات سے ہی اپنا منہ چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ کیونکہ میاں محمد طفیل جس اسلامی آئین کی بات کر رہے ہیں اس کی تیاری میں اگر یحییٰ خاں مصروف تھے تو ہمارے خیال میں اس سلسلے میں انہیں مشورہ بلیک بیوٹی، بیگم جوناگڑھ، نور جہاں، ترانہ اور جنرل رانی دیتی ہوں گی۔ جوں جوں یحییٰ کی یہ حرکتیں سامنے آ رہی ہیں:۔ اسلام پسند سیاسی لیڈروں کے چہروں سے بھی نقاب اٹھ رہی ہے کہ وہ یحییٰ کے اقتدار کو طوالت دینے کے لئے کیا کچھ جتن کرتے رہے ہیں۔ جو لوگ اس وقت یحییٰ حکومت کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ ان کو غدار، وطن دشمن، انتشار پسند اور جانے کیا کچھ کہتے تھے۔ جسارت زندگی، چٹان اور نوائے وقت اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ ان کا کردار بھی نور جہاں۔ بیگم جوناگڑھ، جنرل رانی یا ان کے دلالوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یحییٰ ایوان صدر میں راجہ اندر بنے ہوئے تھے، اور یہ اخبارات ان کے اسلام پسند، محب وطن اور انتقال اقتدار میں مخلص ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ ان کی کچھ معروفیات ملاحظہ ہوں۔

اس کو بھی ”لسی“ دو

میاں محمد طفیل والے ”اسلامی آئین“ کے مصنف صدر پاکستان جنرل آغا محمد یحییٰ خان مشرقی پاکستان کے پہلے طوفان کے بعد اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ڈھاکہ جا رہے تھے۔ وہ فرسٹ کلاس میں بیٹھے تھے۔ پروٹوکول کے مطابق ان کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ ان کے پیچھے مشہور اسلام پسند وزیر نواب زادہ شیر علی اور قیوم خان کے سرپرست وزیر نواب زادہ مظفر علی قزلباش بیٹھے تھے۔ یحییٰ خاں غٹا غٹ شراب پی رہے تھے۔ نوابزادہ شیر علی حسرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یحییٰ خان بے چاری ایئر ہوسٹس سے بھی اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ وہ بے چاری بار بار ہاتھ چھڑاتی تھی۔ مگر بھاگنے کی تاب نہ تھی۔ یحییٰ خان جب شراب پی کر فٹ ہو گئے تو وہ شکار کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اکنامی کلاس میں جہاں عام مسافر بیٹھے تھے وہاں اسلامی جمہوریہ پاکستان اور سب سے بڑی اسلامی مملکت کے صدر جناب یحییٰ خان ڈولتے، ڈگمگاتے پہنچے تو ان کی نظر بلیک بیوٹی پر پڑی جناب صدر نے تمام مسافروں کے سامنے اُسے چھاتیوں سے پکڑ کر اٹھایا ”you hell - یہاں کیا کر رہی ہے۔“

اس نے بڑی تابعداری سے جواب دیا۔ ”مجھے فرسٹ کلاس میں جگہ نہیں ملی۔ ورنہ آپ کے پہلو میں بیٹھتی۔ میں تو آپ کے ساتھ چلنے کے لئے اس فلائٹ میں آئی ہوں۔“

صدرِ معظم نے فرمایا۔ ”چل میرے ساتھ چل۔“

آگے آگے ”بلیک بیوٹی“ اور پیچھے صدر محترم۔ صدر محترم نے صدارتی کاغذات اٹھا کر اسے اپنے ساتھ والی خالی سیٹ پر بٹھا لیا۔ ایئر ہوسٹس کو حکم دیا۔ ”اسے بھی لسی پلاؤ۔“

چند لمحوں بعد ایئر ہوسٹس شراب لے کر آئی تو صدر محترم نے ایک ہاتھ میں ایئر ہوسٹس کا ہاتھ دبایا اور الٹے ہاتھ سے ”بلیک بیوٹی“ کو لسی پلانا شروع کر دی۔ اور ساتھ فارسی کے شعر بھی گنگنانے لگے۔ ایئر ہوسٹس بے چاری بڑی مشکل سے ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔ پھر یحییٰ خان نے کارروائی شروع کی۔ اور بلیک بیوٹی کو انگیا سے محروم کرنا شروع کر دیا۔ یہ کارروائی جاری تھی۔ اس کارروائی کے عینی اور قریبی شاہد نوابزادہ شیر علی خان اور نواب مظفر علی قزلباش خاموشی اور حسرت سے یہ صدارتی کارروائی دیکھ رہے تھے۔ یحییٰ کابینہ کے دوسرے وزراء بھی ساتھ تھے

اسلام پسند اخبارات راجہ اندر کے خلوص کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے

مگر وہ اس نظارے کی قربت سے محروم تھے کیونکہ وہ دور کی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ممکن ہے اسلام پسند شیر علی خان اب اس واقع کو اپنے استعفیٰ کی وجہ بیان کریں۔ لیکن اس وقت وہ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔

زونی تبسم نے ٹیلی ویژن پر گانا کیوں گایا۔؟

ایک مرتبہ میاں طفیل والے اسلامی آئین کے مصنف صدر یحییٰ نے ـــــ ٹیلی ویژن پر "جبی" دھاگہ کا اشتہار دیکھا اس میں دکھائی دینے والی "جبی" انہیں بھاگئی اور وہ ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے۔ ٹیلی ویژن کے جنرل منیجر کو حکم ملا کہ اس قتالۂ عالم کو جہاں پناہ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ جنرل منیجر ٹھہرا ایک غلام اس کی کیا مجال کہ تاخیر کرے۔ عالم پناہ نے اس دوشیزہ کو دیکھا تو اسے اپنے اصولوں اور معیار کے مطابق پایا۔ ایک بار پھر انہیں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس حسینہ کو ٹیلیویژن پر گانا گاتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ حسینہ نے جو ان کے پہلو میں بیٹھی تھی لجا کر کہا "ٹی۔ وی والے مجھے کہاں گانے دیں گے۔ مگر ٹی وی



عطا الرحمٰن علوی

والوں کو جب حکم کی اطلاع ملی تو انہوں نے اس حسینہ کو بلایا۔ کیوں ہماری نوکریوں کے پیچھے پڑی ہے۔ ہم نے کب انکار کیا۔ آؤ اور اپنی آواز کا جادو جگا۔ کراچی والوں نے دیکھا کہ آج تک جو حسینہ صرف اداکاری کرتی رہی تھی وہ آج مغنیہ بن کر دل میں اتر رہی ہے۔ ہوا یوں کہ اس حسینہ کو صرف مٹکنے اور ہونٹ ہلانے کو کہا گیا۔ اور آواز کسی اور کی گونجتی رہی۔ یحییٰ نے دیکھا اور کہا "جانی۔ تم تو نورجہاں سے اچھا گا لیتی ہو۔"

فوجی اکاؤنٹ اور سٹینڈرڈ بنک

یہ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ ایوب خان کی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ تمام سرکاری اکاؤنٹ بشمول فوجی اکاؤنٹ نیشنل بنک میں رکھے جائیں۔ بہت دنوں تک فیصلے کے باوجود فوج کا اکاؤنٹ نیشنل بنک میں نہیں آیا تو نیشنل بنک کے منیجنگ ڈائریکٹر نے اُس وقت کے کمانڈرانچیف جنرل یحییٰ خان سے ملاقات کا وقت مقرر کیا۔ جی ایچ کیو کے ایک افسر کے ذریعے ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ منیجنگ ڈائریکٹر جب کمانڈرانچیف کے کمرے میں داخل ہوئے تو مندرجہ ذیل مکالمات ہوئے۔

کمانڈرانچیف :۔ Who the Hell you are - آپ کون کم بخت ہیں۔

منیجنگ ڈائریکٹر:۔ میں نیشنل بنک کا منیجنگ ڈائریکٹر ہوں۔

کمانڈرانچیف :۔ Who the Hell you have come here آپ کو یہاں کس کم بخت نے آنے دیا۔

منیجنگ ڈائریکٹر:۔ میں پہلے سے طے شدہ وقت ملاقات کے مطابق آیا ہوں۔

کمانڈرانچیف :۔ Who the hell has given you appointment تم کو کس کم بخت نے وقت ملاقات دیا۔

منیجنگ ڈائریکٹر:۔ میں یہاں نہایت ضروری اور قومی کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔

کمانڈرانچیف :۔ Oh Hell speak بولو

منیجنگ ڈائریکٹر:۔ جناب جیسا کہ صدارتی کابینہ نے فیصلہ کیا ہے کہ تمام سرکاری اکاؤنٹ نیشنل بنک میں ہونے چاہئیں۔ میں فوج کے اکاؤنٹ کے لئے بات کرنے آیا ہوں۔

کمانڈرانچیف: To Hell with National Bank. Alvis are my friends Question. Dols not Arise. Account will Be with Standrad Bank

جہنم میں جائے نیشنل بنک، علوی میرے دوست ہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اکاؤنٹ سٹینڈرڈ بنک میں رہے گا۔

اس کے ساتھ ہی منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک کو اشارہ کیا گیا کہ وہ کمرے سے رخصت ہو جائیں۔

سٹینڈرڈ بنک کے علوی صاحبان

علوی صاحبان کا ذکر چلا تو ایک اور قصہ سن لیجئے کہ محمد احمد زبیری صاحب کے ہاں ایک عشائیہ تھا۔ عالمی بنک کے نائب صدر جناب محمد شعیب کے اعزاز میں۔ اس میں مشہور شخصیت جمال میاں فرنگی محلی۔ ڈان کے ایڈیٹر جمیل انصاری جمیل الدین عالی۔ محمد علی رنگون والا، وائی ایچ شیرازی، مسٹر ایس یو درانی اس وقت انوسٹمنٹ کارپوریشن کے چیئرمین تھے۔ ولیکا۔ پی پی آئی کے معظم علی ڈنکس اپ کی شہرت والے اور سٹینڈرڈ بنک کے عطاء الرحمان علوی اور دوسرے حضرات موجود تھے۔ جمال میاں فرنگی محلی وضع دار بزرگ تھے۔ ایک دوسرے کا احترام رکھ رکھاؤ اور وضعداری مشرقی تہذیب کا خاصا ہیں۔ مگر عطاء الرحمان علوی کو نشہ تھا یحییٰ صاحب کی دوستی اور مصاحبی کا۔ اس لئے جب وہ تشریف لائے تو انہوں نے سب حضرات سے ہاتھ ملانے اور بات کرنے میں اپنی توہین جانی اور نہایت رعونت کے ساتھ اپنا سر اکڑائے ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب سب حضرات ڈنر



ترانہ

الفتح



کی ٹیبل کی طرف بڑھے اور پلیٹیں لینے لگے۔ علوی پلیٹ اٹھا چکے تو جمال میاں فرنگی محلی جوان کی رعونت کو سب سے زیادہ محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا علوی بتشہ کے مصاحب ہم بھی رہے ہیں ــــ مگر یہ اترانا ــــ اور پرانے رشتوں کو بھلا دینا تو کم ظرفی ہے۔ عطاء الرحمان علوی اتنی سی بات بھی سننے کی توقع نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے انتہائی غصے میں آکر پلیٹ زمین پر پھینکی۔ اور فوراً گھر سے نکل گئے۔ اس بات پر ایک دم سب چونکے اور ساتھ ہی جمال میاں فرنگی محلی پر دل کا دورہ پڑ گیا، کیونکہ وہ علوی جیسے شخص کی یہ کم ظرفی برداشت نہ کر پائے۔

علوی برادران اور فلیش مین ہوٹل کے دو کمرے

علوی برادران نے فلیش مین پنڈی میں کئی برس تک کمرہ نمبر ۱۳۸ اپنے لئے مخصوص کروا رکھا تھا اس کو بطور خاص آراستہ کیا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ایک طرف بار و شراب خانہ تھی۔ دوسری طرف آراستہ و پیراستہ بیڈ روم تھا۔ یہاں عام طور پر سینئر فوجی افسران کا آنا جانا رہتا تھا۔ مگر جس روز یحییٰ خان کو آنا ہوتا تھا۔ اس روز یہاں کوئی اور نہیں آسکتا تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت سے ہے جب یحییٰ خان بریگیڈیر تھے۔ اس کمرے سے ملکی اور غیر ملکی خواتین بھی نکلتی دکھائی دی ہیں۔

طاہر احمر

غزل

لالہ رُخسار، گُل فشاں سُورج
زندگی کا ہُوا نشاں سورج

اپنی راہوں میں جگمگائیں گے
سیم تن چاند، زر فشاں سُورج

ظلمتوں کے پجاریو! سُن لو
آگیا سر پہ شعلہ جاں سُورج

کل کا لاشہ اُٹھائے کاندھے پر
جا رہا ہے رواں دواں سُورج

مہرباں تم، تو مہرباں ہر شے
مہرباں چاند، مہرباں سورج

تم سلاسل میں اس کو باندھو گے؟
ہاتھ آئے گا کب تپاں سُورج

تیرگی دہر سے مٹانے کو
جل رہا ہے کہاں کہاں سُورج

طوق و زنداں سے رُک نہیں سکتا
زندگی کا ہے بے اماں سُورج

اُن کی چہکار نغمۂ گیتی
ان پرندوں کا آشیاں سُورج

شعلۂ گُل علم بنا احمر
روشنی کا ہے کارواں سُورج

درحقیقت

Genl. 99.

PAKISTAN WESTERN RAILWAY.

From— To—

Divl. Office,
P.W.R. Karachi.

Quote Ref No. 726-W/W1 Dated 5-12-1970.

Sub:- Allotment of Rly: Quarter.

Quarter No. 20, Block No.231 at KYC is allotted to Mr. Bashir Ahmed Fireman F.G.(R) KC.

President,
Housing Committee, P.W. Rly:
Karachi.

Copy to:-

Mr. Bashir Ahmed F/Man -KC.
D.A.O./KYC.
E.F.O./KYC.
F.G.(R) KC.
D.F.O.Bills/KYC.
I.O.W. Pipes/KC.

۲۱۵ روپے تنخواہ

۱۱۵ روپے کٹوتی

نون - الف

پاکستان ویسٹرن ریلوے کی دھاندلی ضرب المثل بن چکی ہے اس محکمہ کے اعلیٰ افسران شاندار زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں بے شمار مراعات میسر ہیں۔ ریلوے کے بنگلوں میں رہتے ہیں۔ ان کے بچے اعلیٰ قسم کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ایرکنڈیشنڈ کوچوں میں سفر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس نچلے درجے کے ملازمین سے ناانصافی کی جاتی ہے۔ ان کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں۔ دفتری قوانین کے مطابق انہیں جو مراعات اور سہولتیں حاصل ہیں۔ قانونی موشگافیوں کی آڑ لے کر ان سے انہیں محروم کردیا جاتا ہے۔ اس کی سینکڑوں مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

بشیر احمد پاکستان ویسٹرن ریلوے میں فائرمین ہے۔ پہلے اس کی پوسٹنگ کوٹری میں تھی۔ اس کا تبادلہ کراچی کینٹ کر دیا گیا۔ اس قسم کے تبادلوں میں چھوٹے ملازمین کو بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کی تعلیم اور رہائش کا مسئلہ سنگین نوعیت کا حامل ہوتا ہے بشیر احمد کو ۲۹ جون ۱۹۶۹ء کو ٹرانسفر کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ کراچی پہنچ کر اپنا کام شروع کردو۔ قہر درویش برجان درویش ہدایت ملتے ہی اس نے بوریا بستر باندھا اور کوٹری سے کراچی کینٹ پہنچ گیا۔ اس کیٹگری کے ملازمین کو ریلوے کوارٹر الاٹ کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسے بھی ۵ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ایک کوارٹر کا الاٹمنٹ دیا گیا جس کا نمبر ۲۹۔۲۰ ڈبلیو/ای ہے۔ کراچی پہنچنے کے بعد اس نے کوارٹر پر قبضہ لے لیا۔

۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء کو بشیر احمد کو ریلوے انتظامیہ کراچی کی جانب سے ایک سرکاری مراسلہ موصول ہوا جس میں کوئی وجہ بتائے بغیر اس سے کوارٹر خالی کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ بصورت دیگر اس کی تنخواہ سے ۵۰ فی صد کٹوتی کی دھمکی دی گئی۔ بشیر احمد حیران تھا کہ آخر اس کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں کی جارہی ہے۔ اگر وہ مکان خالی کردیتا تو پھر وہ اپنے بچوں کے ساتھ کہاں سر چھپاتا اور اگر سرکاری کوارٹر خالی نہیں کرتا تو پھر تنخواہ سے ۵۰ فی صد کی کٹوتی کیسے برداشت کرتا؟

اس نے ریلوے کی انتظامیہ سے فریاد کی۔ اپنے حق میں دلائل دیئے۔ کوارٹر خالی یا خالی نہ کرنے کی صورت میں پیدا ہونے والے سنگین مسائل سے آگاہ کیا۔ مگر اس کی اعلیٰ حکام تک شنوائی نہ ہوئی۔ اس نے ریلوے کی انتظامیہ سے کچھ وقت بھی مانگا۔ مگر اس کی درخواستیں، اپیلیں مسترد کردی گئیں۔ ادھر سے مایوس ہونے کے بعد اس نے قانون کا سہارا لیا اور ایک مقامی عدالت میں ۱۱ فروری ۱۹۷۱ء کو مقدمہ دائر کردیا۔ ابھی یہ مقدمہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کراچی کی عدالت میں زیر سماعت ہے کہ ریلوے انتظامیہ نے ۷ اپریل ۱۹۷۱ء سے اس کی تنخواہ سے ۵۰ فیصد کے حساب سے ۱۱۰ روپے سے لیکر ۱۱۵ روپے کی کٹوتی شروع کر دی۔ اس ظالمانہ کٹوتی کے سبب سے ان دنوں اس کی کل تنخواہ صرف ۹۰ روپے یا ۱۰۰ روپے بنتی ہے۔ وہ اپنے گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لئے دن رات محنت کرتا ہے۔ اوور ٹائم کرتا ہے۔ پھر بھی اس کے معاشی مسائل حل نہیں ہوتے۔

اس کوارٹر کا کرایہ صرف ۷ روپے ہے۔ جب سے اسے کوارٹر الاٹ کیا گیا ہے اس کی تنخواہ سے ہر ماہ سات روپے کی کٹوتی شروع کردی گئی —— اور اب اس کے علاوہ اس کی تنخواہ سے ہر ماہ ۱۱۰ روپے یا ۱۱۵ روپے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ ایک غریب ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ اتنی بڑی رقم کی کٹوتی سرکاری قانون کے مطابق کہاں تک جائز ہے۔ اس کا جواب تو ریلوے کی انتظامیہ ہی دے سکتی ہے۔ رہ گئی نچلے درجے کے سرکاری یا نیم سرکاری ملازمین کے ساتھ دھاندلی تو اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس قسم کی ناانصافی اور دھاندلی ۲۴ سال سے ہر محکمے میں مستقل چلی آرہی ہے۔

بشیر احمد ایک غریب ملازم ہے۔ اس کی تنخواہ پہلے ہی سے اتنی کم رکھی گئی کہ مصارف پورے نہیں ہوتے۔ ریلوے انتظامیہ نے وجہ بتائے بغیر اسے کوارٹر خالی کرنے کا مطالبہ کردیا اور اب اس کی تنخواہ سے ہر ماہ ایک معقول رقم کاٹ لی جاتی ہے اس کا پورا خاندان سنگین معاشی مسائل سے دوچار ہے۔ فاقوں کی نوبت پہنچ چکی ہے۔ مگر انتظامیہ اپنے اس ظلم سے ہاتھ اٹھانے کے لئے تیار نظر نہیں آتی۔

بشیر احمد موجودہ حکومت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس جیسے سینکڑوں، لاکھوں بشیر احمد اپنے پیشہ وارانہ مسائل کے حل کے سلسلے میں بھٹو حکومت کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہیں اپنی تاریک زندگی میں روشنی کی ایک ہلکی کرن نظر آرہی ہے۔ ممکن ہے ان کے مسائل حل ہوجائیں۔

الفتح

خرکاروں کے کیمپ میں



سرکاری افسر سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہمیں ظلم سے نجات نہیں دلاتے تھے۔

شکاری کتّوں کی مدد سے ہم خرکار کیمپ سے بھاگے

نعیم آروی

تین ماہ قبل اُسے خرکاروں کے کیمپ سے رہائی ملی۔

اس کی نجات پولیس کی مرہونِ منت نہیں، اس کے حوصلے کا دخل ہے۔ اس کے جسم پر جابجا زخموں کے گہرے نشانات ہیں ہاتھوں اور پیروں میں زنجیروں اور بیڑیوں نے زخم ڈال دیئے ہیں، اس کی تیزی سے گھومتی ہوئی آنکھوں کی سرخی میں خوف جما ہوا ہے۔ اس کی پوری روداد کراچی کینٹ کی پولیس چوکی میں درج ہے، اسے اپنی ماں کی تلاش ہے، اپنے باپ کی کھوج ہے، اپنی بہن کو یاد کرتا ہے مگر ابھی تک کوئی رشتہ دار نہیں ملا، کراچی کے ایک شریف آدمی نے اسے اپنی فرنیچر کی دکان پر ملازم رکھ لیا۔ اس کے رشتہ داروں کی تلاش میں مدد بھی دے رہا ہے۔

وہ چھ سال کا تھا جب اُسے بردہ فروش اُٹھا کر لے گئے اس نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ کراچی کے کسی علاقہ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ایک بڑی بہن بھی تھی جو اسکول جایا کرتی تھی۔ اس کا باپ رات میں دیر سے گھر آیا کرتا تھا ایک دن اس کی ماں پڑوس میں گئی تھی۔ اس کی بہن اسکول جا رہی تھی، اس نے اسکول چلنے کی ضد کی، مگر بہن راضی نہ ہوئی، اور اُسے گھر پر تنہا چھوڑ کر اسکول چلی گئی۔ وہ روتا ہوا اپنی بہن کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ اچانک کسی نے اسے گود میں دبوچ لیا اور منہ پر کپڑا رکھ دیا۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہ رہا، وہ سو گیا، بہت گہری نیند تھی۔

اس نے اپنا نام رشید بتایا۔ یہ اس کا اصلی نام نہیں ہے اسے یاد نہیں کہ اس کے والدین نے اس کا کیا نام رکھا۔ یہ نام اس نے کراچی میں آنے کے بعد رکھ لیا ہے۔ اس نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کب آنکھ کھلی، کیسے کھُلی، مجھے کچھ معلوم نہیں، جب آنکھ کھُلی تو میں ایک بہت بڑے کمرے میں تھا۔ اس کمرے میں چار لڑکیاں اور دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ لڑکیاں بڑی تھیں۔ اس کچے مکان میں اس طرح کے چار بڑے کمرے تھے، جن میں بے شمار بچے رکھے گئے تھے، مجھے ان میں سے ایک لڑکی کے حوالے کر دیا گیا جس کا نام سکینہ تھا۔ میں اپنی ماں کے لئے روتا تھا تو سکینہ کمرے کے ایک کونے میں چھپ جاتی، دوسری لڑکیاں کہتیں "آؤ ہم تمہیں تمہاری ماں سے ملواتے ہیں" پھر وہ مجھے سکینہ کے پاس لے جاتیں اور کہتیں "دیکھو یہ تمہاری ماں ہے"۔ میں رونے لگتا اور ان سے کہتا "نہیں۔ یہ میری ماں نہیں ہے"۔ میرے چیخنے چلانے کی آواز سن کر ایک لمبا تڑنگا خرکار اندر آتا۔ لمبا سا چاقو کھول کر کہتا۔ "اگر تو روئے گا۔ تو جان سے مار دے گا۔" شور کے پلّے چپ ہو جا۔ میں سہم کر خاموش ہو جاتا۔ سکینہ مجھے گود میں دبا لیتی۔ یہ بچوں کے پالنے کا اڈہ تھا۔ پورے پاکستان سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے اس خفیہ جگہ پر پہنچایا جاتا۔ ان کی دیکھ بھال اور پرورش چند جوان عورتیں کرتیں، جب ہم رات کو سو جاتے تو خرکار ان عورتوں کو باہر لے جاتے کبھی کبھی سکینہ کی چیخ بھی باہر سے سنائی دیتی۔ اس طرح دس سال اس گمنام کیمپ میں گذر گئے۔ مجھے اس کمرے سے کبھی باہر نہیں

نکالا گیا۔

ایک دن اس کیمپ میں باہر سے خرکاروں کا کوئی دوسرا ٹھیکیدار آیا، بڑی بھیانک شکل تھی۔ بڑی بڑی مونچھیں، سرخ سرخ آنکھیں اس کے پاس بندوق اور پستول تھے۔ اسے سارے بچوں کو دکھلایا گیا۔ اس نے بھیڑ بکریوں کی طرح بچوں کو دبا کر، کھینچ کر دیکھا، شام ہوئی تو مجھے بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس کے ٹرک پر بٹھا دیا گیا سکینہ کو مجھ سے بہت محبت ہو گئی تھی، وہ میری جدائی سے چیخنے چلانے لگی خرکاروں نے اسے بہت مارا، اس کے منہ سے خون گرنے لگا، پھر بھی وہ روتی رہی۔ ایک خرکار نے اسے گولی مار دی۔ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ "وہ میری اصلی ماں نہیں مگر اصلی ماں بن گئی۔ وہ ابھی تک مجھے یاد ہے۔ جب تک زندہ رہوں گا یاد آتی رہے گی"۔

دوسرے ٹھیکیدار نے ٹرک میں بیٹھے ہوئے لڑکوں کو بے ہوش کر دیا۔ ویسے بھی ہمارے پیروں اور ہاتھوں میں لوہے کے کڑے بندھے ہوئے تھے۔ اس طرح ہمیں بے ہوش کر کے، ٹرک کے ذریعے لاڑکانہ کے کسی قریبی علاقے میں پہنچا دیا گیا۔ دوسرے دن ہماری بیڑیاں کھول دی گئیں اور ہمیں ایک جگہ لے جایا گیا۔ اس جگہ ایک پل بنایا جا رہا تھا۔ مجھے مٹی اٹھانے والے گدھے کو ہانکنے کے کام پر لگا دیا گیا۔ ان میں کچھ لڑکوں کو مٹی کھودنے اور اٹھانے پر لگایا گیا ہم سے بہت کام لیا جاتا۔ اگر ہم تھک کر زمین پر بیٹھ جاتے یا سستانے لگتے تو کیل لگے ہوئے ڈنڈے سے ہمیں ہنکایا جاتا۔

رشید نے اپنی قمیض اٹھا کر دکھایا اس کے سینے اور پیٹھ پر کیلوں کے بے شمار نشانات تھے۔ اس نے بتایا۔ یہاں کچھ دن رہنے کے بعد پتہ چلا کہ اس علاقہ کا نام گڈار ہے اس کے علاوہ اس جگہ اس جیسے پچاس لڑکے تھے۔ صرف ایک وقت کھانا دیا جاتا۔ کھانے میں روٹی، پیاز اور سلیمانی چائے دی جاتی۔ صبح کو صرف سلیمانی چائے ملتی۔ شام کے وقت جب کام بند کیا جاتا تو سارے لڑکوں کے ہاتھوں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال کر کچے مکان کے ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا۔

رشید نے بتایا کہ خرکاروں کا یہ ٹھیکیدار بہت ظالم بے رحم تھا، چوکیدار بھی بہت حرامی تھے، رات کو خوب نشہ کرتے اور کمرے میں گھس آتے۔ ہمارے جسم کو بھوکے کتے کی طرح کاٹتے تھے، میں بتا نہیں سکتا کہ وہ ہمارے ساتھ کیا کیا کرتے، چاقو سے جسم کے بعض حصے کو کاٹ دیتے۔ کئی لڑکے ان کے ظلم سے مر گئے، ان کی لاش کو مٹی کھود کر گاڑ دیتے یا نہر میں پھینک دیتے۔ مجھے ایک سال تک اس جگہ رکھا گیا، پھر مجھے میرپور خاص کے ایک بڑے خرکار کے ہاتھوں فروخت کر دیا میرے علاوہ تین لڑکوں کو بھی بیچا گیا۔

میرپور خاص کے کسی گمنام علاقہ کے کیمپ میں مجھے رکھا گیا۔ وہاں سڑک بن رہی تھی۔ مجھے مٹی کی کھدائی اور بھرائی کے کام پر لگایا گیا۔ خرکاروں کے چوکیدار ہر وقت ہمارے اوپر مسلط رہتے ہم کہنے کو آزاد تھے۔ مگر ہماری دیکھ بھال کے لئے خونخوار چوکیدار اور شکاری کتے گھومتے رہتے تھے۔ اس جگہ سرکاری آدمی بھی آتے تھے۔ مگر وہ ہماری طرف توجہ نہیں دیتے۔ انہیں خرکاروں کی طرف سے رقم ملتی تھی، وہ ہمارے بارے میں جانتے تھے۔ مگر خاموش رہتے تھے۔ میں نے وہاں سے بھاگنے کی کئی بار کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوا بڑی مار پڑی، میرے بار بار بھاگنے سے وہاں کے خرکار ڈر گئے چنانچہ مجھے وہاں سے کسی دوسری جگہ بہت بڑے کیمپ میں بے ہوش کر کے بھیج دیا گیا۔ اس کیمپ میں چار سو بچے تھے۔ یہاں جتنا ظلم ہوا، اور کہیں نہیں ہوا، سردی اور گرمی سے سال کا پتہ چلاتے تھے۔ ہمیں بھوکا رکھا جاتا۔ ہم اتنے کمزور ہو جائیں کہ بھاگ نہ سکیں۔ ایک وقت سوکھی روٹی اور ایک کٹورہ پانی کا دیتے، جسم میں سوئیاں مارتے تھے۔ ایک ایک لڑکے کے لئے ان میں چھینا جھپٹی ہوتی، اگر ان کے ظلم سے کوئی لڑکا مر جاتا تو اس کی لاش نہر میں بہا دیتے، دن بھر کام لیا جاتا۔ رات بھر کام لیا جاتا۔ شراب، چرس اور افیون استعمال کرتے تھے۔ اگر کوئی لڑکا انکار کرتا تو پھر اس کا خوب تماشہ بناتے یہاں تک کہ وہ لڑکا بے ہوش ہو جاتا یا مر جاتا ــ ایک دن اس جگہ ایک نوجوان ڈرائیور لایا گیا۔ اسے کام دلانے کے بہانے اغوا کیا گیا تھا۔ ڈرائیور نے جب یہاں کا حال دیکھا تو چیخنے چلانے لگا "تم لوگ مجھے کہاں لے آئے۔ یہ تو بیگار کیمپ ہے ــ میں تم سب کو جان سے مار دوں گا۔ مجھے چھوڑ دو، چھوڑ دو"

ڈرائیور کو چپ کرانے کے لئے کئی خرکار اس پر ٹوٹ پڑے زبردست لڑائی ہوئی۔ تین خرکار زخمی ہو گئے۔ خرکاروں نے جب دیکھا کہ ڈرائیور ان کے قابو میں نہیں آ رہا ہے تو انہوں نے اس کے سر پر لوہا مار کر بے ہوش کر دیا۔ اس کے بعد اسے اتنا مارا کہ وہ کئی دنوں تک زمین سے اٹھ نہ سکا۔ پھر اسے چھت سے باندھ کر الٹا ٹکا دیا گیا۔

اس طرح کئی مہینے گذر گئے۔ ڈرائیور خاموش رہتا۔ جب کبھی اسے موقع ملتا وہ ہمارے پاس آکر ہمیں بھاگ نکلنے پر اکساتا اس نے تین لڑکوں کے ساتھ جس میں میں بھی شامل تھا۔ بھاگنے کا منصوبہ بنایا۔ ہمیں سب سے زیادہ شکاری کتوں سے خوف آتا تھا، چنانچہ ہم اپنی بچی ہوئی روٹیاں کتوں کو کھلا کر انہیں اپنا دوست بنانے لگے۔ ایک ہفتے کے بعد شکاری کتے اپنے دوست بن گئے۔ ایک رات کیمپ میں سارے خرکار کار جشن منا رہے تھے۔ شراب پی پی کر آؤٹ ہو گئے یہ موقع بہت اچھا تھا، ڈرائیور اور تین لڑکے کیمپ سے فرار ہو گئے دونوں لڑکے عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ رات بھر بھاگتے رہے ایک پہاڑی غار میں کچھ دیر آرام کے لئے سو گئے ان میں سے ایک لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا۔ پیاس سے اس کا حلق سوکھنے لگا۔ ڈرائیور پانی کی تلاش میں نکل گیا۔ جب وہ پانی لے کر واپس پہنچا تو لڑکا مر گیا۔ ہم نے اسے وہیں گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ خرکاروں کے خوف سے ہم نے دوبارہ بھاگنا شروع کیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ راستے میں جنگل آئے۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں آئیں، دیہات بھی ملے مگر کہیں ٹھہرے نہیں۔ روٹی کے چند ٹکڑے مل جاتے تو انہیں کھا کر دوبارہ بھاگنا شروع کر دیتے۔ شاید ہم بلوچستان کے کسی علاقہ میں نکل آئے تھے۔ راستے میں کئی کئی دن

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں

خرکار کیمپ میں قید تین لڑکوں کے پیغامات

رشید نے بتایا۔ خرکاروں کے کیمپ سے جب کوئی بھاگتا ہے۔ تو دوسرے لڑکے اس بات کو راز میں رکھتے ہیں۔ اگر کسی لڑکے کو اپنا گھر یاد رہتا تو وہ بھاگنے والے لڑکے کے ذریعے اپنے ماں باپ کو پیغام بھجواتا ہے۔ میں جب کیمپ سے نکل کر بھاگا تو تین لڑکوں نے اپنے ماں باپ کو پیغام دیا ہے۔

پہلے لڑکے کا نام شبیر احمد ہے۔ اس کے والدین کورنگی میں رہتے ہیں۔ اسکول میں پڑھتا تھا۔ خرکاروں نے اسے راستے سے اغواء کر لیا۔ اس نے اپنے باپ کا نام رفیق بتایا ہے۔

دوسرے لڑکے کا نام منظور ہے۔ کراچی میں صدر کے علاقے میں کہیں اس کا گھر ہے۔ والدین کسی حادثے کا شکار ہو کر مر چکے ہیں۔ اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ اسے بے ہوش کر کے اغوا کیا گیا۔

تیسرے لڑکے کا نام حبیب ہے۔ اس کا گھر جو رنگی ناظم آباد میں ہے۔ اسکول سے واپسی پر اسے اغوا کیا گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا گھر بہت بڑا ہے۔

رشید نے بتایا۔ کراچی کے کئی علاقوں میں خرکاروں کا خفیہ اڈہ ہے، بچوں اور لڑکوں کو اغوا کر کے اس جگہ لایا جاتا ہے۔ پھر یہاں سے سندھ، سرحد اور بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے لوگ ان سے ملے ہوئے ہیں۔



پیکنگ سے ایک خط

روس نے طورخم کے راستے بھارت کو اسلحہ سپلائی کیا

حامد ہاشمی

اگست میں بھارت روس معاہدے کے ساتھ ہی پاکستان کے بارے میں ان دونوں ملکوں کے عزائم واضح ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سے بھارتی ذرائع ابلاغ اور بھارتی راہنماؤں نے جو لب و لہجہ اختیار کیا تھا اس نے قطعی طور پر مزید کسی خوش فہمی کی گنجائش ختم کر دی تھی۔ اندرا گاندھی اور دوسرے بھارتی لیڈروں کی طرف سے متواتر دوسرے ممالک کے طوفانی دورے صاف اس امر کے غماز تھے کہ پاکستان پر حملے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اس کے لئے بین الاقوامی رائے عامہ کو ہموار کیا جا رہا ہے پاکستانی اخبارات کے مندرجات اور پاکستانی سیاسی لیڈروں کے بیانات سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں بھارتی حملے کے خطرے کا بھرپور احساس پایا جاتا ہے۔ اس لئے جب بھارت کی طرف سے بڑے پیمانے پر مسلح جارحیت کا آغاز ہوا تو کوئی حیرت نہ ہوئی کہ ہر آن اس کی توقع تھی۔ دل اعتماد سے معمور تھا کہ اب کے بھارتی جارحیت کے منہ پر ۱۹۶۵ء سے بھی زیادہ کالک لگے گی۔ خیال یہ تھا کہ فوجی حکمرانوں نے عوام کو مسلسل اقتصادی بحران کا تحفہ دے کر اس گراں قیمت پر خاطر خواہ فوجی تیاری تو ضرور کر لی ہو گی۔ گزشتہ آٹھ نو ماہ کے واقعات اور بھارتی حکمرانوں کا رویہ یوں بھی متقاضی تھا کہ اس سلسلے میں کوئی غفلت نہ ہوتی۔

مشرقی سیکٹر میں ہوائی تحفظ نہایت کمزور ہونے کے باوجود اور بے سرو سامانی کے عالم میں پاکستان کے جوانوں نے جس پامردی کے ساتھ جیسور کا دفاع کیا تھا اس سے دل بہت بڑا ہو جاتا تھا۔ خود مشرقی سیکٹر کے بھارتی کمانڈر جگجیت سنگھ اروڑا نے اپنی پریس کانفرنس میں بڑی فراخ دلی کے ساتھ پاکستانی جوانوں کی بہادری کا اعتراف کیا تھا۔ مغربی پاکستان کے دفاع کے سلسلے میں تشویش کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ تک امید تھی کہ اگر بھارت عارضی طور پر مشرقی پاکستان کی مخصوص جغرافیائی صورت حال کی بنا پر وہاں قبضہ کرنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو مغربی سیکٹر میں اس کی تلافی ہو جائے گی۔ اور پھر جب فریقین مذاکرات کی میز پر بیٹھیں گے تو پاکستان قوت اور اعتماد کی پوزیشن سے بات کر سکے گا۔

جب بیرلوں نے باغ وطن پر آگ برسائی تو اس کی ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھا پھل اتنا یاد آیا کہ دل تڑپ تڑپ گیا۔ اور جو منٹی ہیں وجود دیتی ہے۔ اس کی حرمت کا بھرپور احساس اسی وقت جاگتا ہے جب ہم اس سے دور ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ اڑ کر پاکستان پہنچوں، لیکن صرف تلملا کر رہ جاتا۔ رات دو بجے تک ریڈیو کے ساتھ چپکا خبروں کے بلیٹن سنتا۔ پاکستانی اسٹیشن شاذونادر ہی سنائی دیتے۔ کوئی نہ کوئی قریبی طاقت ور اسٹیشن انہیں دبائے رکھتا۔ بھارت کے اسٹیشن صاف سنائی دیتے تھے اور سارے اسٹیشنوں سے فلمی گیت نشر ہوتے رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب کے بھارتی حکمرانوں نے مکمل تیاری اور پورے اعتماد کے ساتھ جارحیت کا آغاز کیا ہے۔ گستاخی نہ ہو تو عرض کر دوں کہ اب کی بار ریڈیو پاکستان کی کارگزاری کچھ زیادہ لائق ستائش نہیں رہی۔ اس پر بحیثیت مجموعی جذباتیت کی سی فضا چھائی رہی۔ قارئین کرام! جذبات اور جذباتیت کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھیں۔ جنگ اور امن کا مسئلہ بنیادی طور پر سیاسی مسئلہ ہے سو اس کے سلسلے میں اپروچ جذباتی نہیں۔ سیاسی ہونی چاہیئے ریڈیو ایسے اہم ذریعہ ابلاغ کا فرض ہے کہ قومی مسائل کے ضمن میں عوامی ذہن کی تربیت کرے۔ انہیں گردوپیش کے ٹھوس حالات سے آگاہ کرے اور ان کا حقیقت پسندانہ طریقے سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرے۔ محض جذباتیت کی فضا پیدا کر دینے سے کبھی کوئی مسئلہ حل ہوا ہے نہ ہو گا۔ اس سے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تلخ حقائق اندھی جذباتیت کا کندھا جھنجوڑتے

امریکہ نے حکومتِ پاکستان کو مغربی پاکستان کی

سرحد پر جنگ بندی پر مجبور کیا





ہیں تو لوگ مایوسی اور بددلی کی پستیوں میں جا گرتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی اسٹیشن اس غلط نہج میں اس حد تک آگے بڑھا کہ ایک شام یہاں سے کسی محترمہ کا یہ تک اعلان نشر ہوا کہ انہوں نے فوجی بھائیوں کے لئے ایک ایسا تعویذ تیار کیا ہے جسے جس محاذ پر بھی لے جائیں دشمن کو نیست و نابود کر کے فتح کے جھنڈے گاڑ دے گا۔ آیا خیال شریف میں کہ ریڈیو پاکستان کس دور میں کیا کیا لطیفے نشر کرتا رہا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ پاکستان کی خبروں کے لئے بیشتر غیر ملکی ریڈیو اسٹیشنوں ہی پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ جب یہ اسٹیشن پاکستان کے مقابلے میں بھارت کی جنگی کامیابیوں کا ذکر کرتے تھے تو ذہن اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ کیونکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ان کرم فرماؤں نے بڑی بے حیائی کے ساتھ ساری فتوحات، خبروں کی حد تک بھارت کی جھولی میں ڈال دی تھیں۔ جاپان اور آسٹریلیا نسبتاً صاف سنائی دیتے تھے۔ لیکن دونوں رسمی سی خبریں بی بی سی اور وائس آف امریکہ کے حوالے سے دہرا دیتے تھے۔ وائس آف امریکہ کا رویّہ کسی قدر معقول رہا۔ اس "کسی قدر" کو حذف کر دیں تو "معقول" کی حیثیت بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ وائس آف امریکہ سے خبروں پر تبصرہ کرنے والوں میں ایسے ایسے افلاطون بھی شامل ہوتے تھے جو بالکل میاں مٹھو کی طرح اندرا گاندھی کے "قصہ ہائے درد" کو دہراتے تھے۔ اور وہ جو کسی قدر معقول تھے۔ ان کی معقولیت بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھتی تھی کہ پاکستان اور بھارت پر جنگ کی مشترکہ سی گول مول ذمہ داری ڈال کر روس کی طرف سے بھارت کی پیٹھ ٹھونکنے پر دبی زبان میں شکایت کر دیتے تھے کہ "ہائے ہرجائی" تم سے یہ امید تو نہ تھی امریکی حکمرانوں کا سارا دکھ اسی قدر ہے کہ آنا ٹوٹا بھارت روس کی گود میں جا بیٹھا ہے۔ اور نام نہاد "بنگلہ دیش" بھی جس کے سلسلے میں امریکی حکمرانوں کی انوسٹمنٹ روس والوں سے کسی طور پر بھی کم نہیں۔ بھارت اور روس کی جیب میں گھس گیا ہے۔

اور بی بی سی محترمہ کا رویّہ تو اس حد تک مخاصمانہ رہا کہ اس کی کوئی تاویل بھی نہیں ہو سکتی۔ یوں لگتا تھا کہ پاکستان نے ماؤنٹ بیٹن کو اپنا پہلا گورنر جنرل قبول نہ کر کے سابقہ سفید آقاؤں کے پندارِ عظمت کو جو کاری زخم لگایا تھا وہ ناسور بن کر بہہ رہا ہے اور مریض ہے کہ شدید کرب اور اذیت کے عالم میں واہی تباہی بکے جا رہا ہے سو اس بی بی سی نامی بڑی بی نے ڈھونڈ کر ہر قابلِ تصوّر گناہ پاکستان کے ساتھ منسوب کیا اور ہر نیکی کا اجر بھارت ماتا کے قدموں میں ڈال دیا اے سوداگرو مانا کہ پاکستان کے مقابلے میں بھارت کے ساتھ تمہارے کہیں زیادہ کاروباری مفادات وابستہ ہیں۔ لیکن اتنی بھی جانبداری

کیا کہ تمہاری عزت مآب "مثالی جمہوریت" کے سر سے اوڑھنی تک اڑ جائے۔ اسے اپنی تہذیب و شائستگی پر ناز کرنے والو، دنیا داری کی خاطر ہی سہی۔ صرف ایک دفعہ اپنے گریبان میں ضرور جھانک کر دیکھ لو۔ کیونکہ ہم اگر بات کریں گے تو شکایت ہو گی۔

ماسکو ریڈیو کی حالت البتہ قابلِ رحم تھی۔ یہاں سے انگریزی اور اردو میں نشر ہونے والی خبروں میں بلاناغہ بھارت پر پاکستان کے ناقابلِ بیان مظالم کی رُوح فرسا داستانیں سنائی جاتیں۔ رقت سے بیچاروں کا گلا رندھا رہتا اور موٹے موٹے آنسو بہا کر اقوامِ عالم کے گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ضمیر کو بھارت کے حق میں بیدار کرنے کی سعیٔ لاحاصل جاری رہتی۔ اور پھر اس زور و شور سے امن امن کی دہائی دی جاتی کہ بے چارا آسمان تک "روسی امن" کے خوف سے لرزنے لگتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ "امن"، گویا روسی حکمرانوں کا بگڑا ہوا اکلوتا بچہ ہے جو اہلِ پاکستان کے ورغلانے پر بدنصیب والدین کے سکون کا سارا اثاثہ سمیٹ کر گھر سے بھاگ گیا ہے اور جس کی راہ تکتے تکتے بوڑھے ماں باپ کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔" اے پاکستان والو، ہے کوئی دل والا جوان بے کسوں کے حال زار پر ترس کھائے اور ان کی آخری موت سے پہلے صرف ایک دفعہ ان کے بچھڑے ہوئے لال کو ملا کر ان کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائے" اے سوشل سامراجیو! اے عوام کے دشمنو! اے انقلاب کے غدارو! اے عظیم لینن کے ناخلف جانشینو، اے سُرخ پرچم کا نعرہ لگا کر سرخ پرچم کی دھجیاں بکھیرنے والو، کاش تم نے اتنا ہی

سوچا ہوتا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے جن عوام کی پشت میں تم نے اپنی "امن پسندی" کا چھرا گھونپا ہے، تمہاری تعمیر میں خود ان کا خون بھی شامل ہے۔ روس کے انقلاب کو تحفظ دینے کے لئے انہوں نے بھی جیلیں بھگتی ہیں۔ اذیتیں سہی ہیں، گھر بار سے محروم ہوتے رہے ہیں۔ جلا وطنی کا کرب برداشت کیا ہے۔ گولیاں کھائی ہیں اور غیر ملکی آقاؤں اور ان کے مقامی جانشینوں سے ففتھ کالمسٹ اور غداران وطن کے خطابات لئے ہیں۔ اے سُپر پاور کی مسندِ فرعون پر بیٹھ کر دنیا کو "حلقہ ہائے اثر" میں تقسیم کرنے کی سازشیں کرنے والو تم جو پتھر اٹھا رہے ہو وہ خود تمہارے ہی پاؤں پر گرے گا۔ اے جارحیت کے دیوتاؤ تمہارا انجام بخیر ہو ہی نہیں ہو سکتا۔

ریڈیو پیکنگ دن رات دنیا بھر کی تمام اہم زبانوں میں پاکستان کے خلاف روس بھارت سازش کی قلعی کھولتا رہا اور سخت ترین الفاظ میں اس کی مذمت کرتا رہا۔ یہاں آغاز جنگ کے چند ہی روز بعد چوکوں اور بازاروں میں جگہ جگہ لاؤڈ اسپیکروں پر عوام کو پاکستان کے خلاف بھارت روس جارحیت کے پس منظر اور اس کی تفاصیل سے آگاہ کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ یہاں عوام کو "Mobilise" کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ بتدریج ٹمپو کو تیز کیا جا رہا تھا۔ یہاں کچھ اس قسم کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ گویا براہ راست چین اس جارحیت کا نشانہ ہو۔ ہر فرد اس سے متاثر نظر آتا تھا۔ حکومت چین کے ۱۶ دسمبر کے بیان میں بھارت کو سخت تنبیہ کی گئی تھی اور اس میں بعض بالکل نئے واضح اشارے

موجود تھے۔ پاکستان کے ایک حصے میں اندرونی بے چینی کو وجہ جواز بنا کر بھارت نے جو مسلح جارحیت اور مداخلت کی تھی، اس کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "سب جانتے ہیں کہ بھارت میں بھی قومیتوں کے مسائل موجود ہیں جو اس قدر پیچیدہ اور سنگین، صورت اختیار کر چکے ہیں کہ دنیا کے کسی دوسرے حصے میں شاذ و نادر ہی اس کی نظیر مل سکے گی۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر دوسرے ممالک بھارت کے ساتھ وہی سلوک کریں جو بھارت آج پاکستان کے ساتھ کر رہا ہے اور بھارت کے خلاف مسلّح قوّت استعمال کریں تو بھارت کا ردِ عمل کیا ہو گا۔"

اس کے اگلے ہی روز سکم کی سرحد پر بھارتی فوجیوں کی طرف سے سرحدی خلاف ورزی پر نہ صرف سخت احتجاج کیا گیا بلکہ وارننگ بھی دی گئی۔ یہ ساری باتیں اپنے اندر مفہوم رکھتی تھیں۔ اگرچہ پاکستان اور چین کے درمیان کوئی فوجی معاہدہ موجود نہیں لیکن چین کا یوں بتدریج آگے بڑھنا اس امر کا متقاضی تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے اور مغربی سیکٹر میں ذلت آمیز جنگ بندی قبول کرنے میں اس قدر مستعدی کا مظاہرہ نہ کیا جاتا۔

اور اب تو اتنے بے شمار سوال گردنیں اٹھا اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانک رہے کہ بس نروس کئے دے رہے ہیں۔

ان سے کہاں بھاگ جاؤں؟ فرار کی کوئی راہ نہیں۔ سوچتا ہوں جس روز روس نے بھارت کے ساتھ جارحیت کا معاہدہ کر کے خود کو ایک فریق کی حیثیت سے بالکل ننگا کر دیا تھا۔ اس کے بعد روس کی بدستور غیر جانب داری کا ڈھنڈورا پیٹ کر ملک کے عوام کو دھوکا دینے میں کیا مصلحتیں پنہاں تھیں؟ وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری سلطان محمد خاں صاحب کیوں بھاگے بھاگے ماسکو پہنچے تھے کہ مائی باپ خطا معاف کر دو۔ آئندہ کبھی گستاخی نہیں ہو گی۔ واپسی پر کیوں عوام کو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ روسی حکمرانوں نے پاک بھارت تنازعے میں غیر جانب داری کا یقین دلایا ہے۔ اگر ہمارے یہ اربابِ اقتدار سیاسی بصیرت سے اس حد تک عاری ہے کہ آنکھوں کے سامنے ہونے والی سازشوں تک کو نہیں دیکھ پاتے تو آخر انہیں مسلسل عوام کی پشت پر سوار رہنے پر کیوں اصرار ہے۔ مجھے وہ گھڑی کبھی نہیں بھولتی جب معراج محمد خان نے لال کرتی راولپنڈی کے جلسہ عام میں اس بات پر حکمرانوں کو غیرت دلائی تھی کہ روسی ہتھیاروں کو طورخم کے راستے پاکستان میں داخل ہو کر واہگہ پار پہنچانے کی کیوں اجازت دی گئی تو انہیں اور پرویز رشید کو چھ چھ سال قید بامشقت سنا دی گئی تھی (یہ خبر ندائے ملت میں شائع ہوئی تھی۔ جس کی کسی طرف سے کبھی تردید نہیں ہوئی)

کسی نے یہ نہ سوچا کہ یہی ہتھیار کل کو کتنی قیمتی پاکستانی زندگیوں کو خاک و خون میں لٹائیں گے۔ پھر خیال آتا ہے کہ دنیا بھر کے دارالحکومتوں میں موجود ہمارے سفارتخانوں نے کیا کیا کارگزاری دکھائی؟ ان سفارت خانوں میں کام کرنے والے ذمہ داروں نے کس حد تک بیرونی دنیا کو پاکستان کے منصفانہ اور صحیح نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔؟ کیا اس محاذ پر ہماری پسپائی میدان جنگ کی شکست سے بھی زیادہ شرمناک نہیں۔؟ سفارت خانوں کی سلطنتوں کے ان بادشاہوں پر کتنا قیمتی زرِ مبادلہ کتنی بڑی مقدار میں صرف ہوتا ہے۔ کیا کبھی یہ بزرگ یہ سوچنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ پاکستان کے غریب عوام اپنا لہو جلا کر ان بڑے لوگوں کا بھرم رکھے ہوتے ہیں۔ کبھی ان سے ان کے اعمال کا حساب بھی مانگ سکتے ہیں۔ برطانیہ اور فرانس نے پچھلی جنگ میں تو پاکستانی موقف کی حمایت کی تھی۔ اس دفعہ ان دونوں ممالک کا معاندانہ رویہ کیا ہماری سفارتی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت نہیں۔؟

قارئین حضرات، جس لمحے کاغذ قلم لے کر لکھنے بیٹھا تھا تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ وہ تاثرات جو جنگ کے دوران اور اس کے فوراً بعد محسوس کئے تھے قلم بند کر دوں۔ لیکن جب میں لکھ رہا ہوں تو جذبات کی گرفت میں ایسا آیا ہوں کہ لمحے پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے —— سوچیں یلغار کر رہی ہیں اور لمحہ پھسل پھسل جا رہا ہے۔ تصورات چھلاوؤں کی طرح لپک لپک کر دامن گیر ہو رہے ہیں۔ کوئی اپنے آپ سے کب تک آنکھیں چرا سکتا ہے؟ ہاں تو اقوام متحدہ میں جو تماشہ ہمیشہ ہوتا ہے سو ہوا۔ "بڑے بڑوں" نے امن، انصاف اور انسانیت کے نام پر اونچی اونچی تقریریں کیں۔ "اعلیٰ طاقتوں اور ان کے جونیئر حصے داروں نے خوب خوب اداکاری کے جوہر دکھائے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ یو۔ این۔ او بے چاری بوڑھی خارش زدہ کتیا کی طرح نحیف سی آواز میں عادتاً بھونکتی رہی۔ جارحیت کا قافلہ اسے بے ضرر سمجھتے ہوئے اور اس پر توجہ کئے بغیر —— اپنی منحوس منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ چور اور ڈاکو سب کے سامنے کھلے دروازوں میں سے دوسرے کے گھر میں گھس آئے۔ ڈھاکے پر قبضے کا انتظار تھا، سو ہو گیا اور ساتھ ہی جنگ بندی بھی ہو گئی۔

"زود پشیماں"۔ امریکہ بہادر کو اپنے چاہنے والوں کا خیال بھی آیا۔ لیکن کس اسٹائل سے۔ ساتویں بحری بیڑے کے آٹھ جنگی جہاز جب خلیج ٹونکن سے خلیج بنگال کے لئے چلے تھے تو عجیب سا لگا تھا۔ امریکی پریس اور وہائٹ ہاؤس کے قریبی حلقوں نے اس تفریحی سفر کو خاص طریقے سے پُراسرار بنا کر خوب خوب کمپنی کی مشہوری کی۔ لیکن آج تک یہ سوال ذہن کے کواڑوں کو کھٹ



بھارت روس معاہدہ امن —— نتیجہ تباہی و بربادی

چینی عوام کو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے روس بھارت سازش سے باخبر کیا گیا

کھٹار ہا ہے کہ آخر اس ڈرامے کا مقصد کیا تھا؟ کون جانے "بڑوں" کی ہاٹ لائن پر کیا کیا مکالمے ہوتے رہے؟ کیا اس سے بھارت کو یہ اشارہ کرنا مقصود تو نہیں تھا کہ ڈھاکہ پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں ذرا مستعدی سے کام لو تاکہ ہم بھی خواہوں کے روپ میں برابر کا جوڑ چھڑانے کے لئے اگلی کارروائی کریں۔ بورژوا سیاست شاطری کا دوسرا نام ہے۔ اس کا اپنا مذہب اپنے اصول اور اپنے اسرار ہوتے ہیں۔ تاشقند میں ہمارے ساتھ جو ہوا تھا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے مختلف نہیں تھا۔ تاریخ کا وہ تلخ سبق ایسا نہیں تھا کہ اسے اتنی جلدی فراموش کر دیا جاتا۔ امریکہ ہمارے بہت طاقت ور دفاعی حلیف نے یوں حق دوستی ادا کیا کہ مغربی پاکستان کی سرحد پر بھی ہم سب سے ہتھیار رکھوا لئے۔ ــــ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

آج ہم پر احسان دھرا جا رہا ہے کہ اگر امریکی دباؤ اور اثر و رسوخ کی بنا پر جنگ بندی نہ ہوتی تو بھارت مغربی پاکستان پر بھی قبضہ کر لیتا۔ جی ہاں کیوں نہیں، دشمنوں کا منہ کالا۔ پاکستان گاجر مولی تھا نا جسے بھارت ہضم کر جاتا۔ اگر یہ جنگ جاری رہتی تو پاکستان میں اس کا کردار عوامی جنگ بن جاتا جو بھارت کی روایتی جارحانہ مہم بازی کی دو مہینوں میں کمر توڑ کر رکھ دیتا اور عوامی جنگ کا تصور وہ تصور ہے جس سے امریکہ بہادر اور سوویت سوشل سامراج کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ سو امریکہ جی، آپ ہمارے دوست بن کر ثالث بن بیٹھے اور وطن عزیز میں بسنے والے آپ کے فرماں برداروں نے آپ کی اطاعت گزاری میں ایک لمحہ توقف نہ کیا۔

خود ساختہ صدر یحییٰ صاحب، آپ نے تو یہ شرمناک جنگ بندی قبول کرنے سے صرف ایک روز قبل قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "جنگ کے ایک محاذ پر عارضی ہزیمت کا کسی طور بھی یہ مطلب نہیں کہ ہماری جد و جہد ختم ہو گئی ہے۔ ہم ایک لڑائی ہار سکتے ہیں لیکن بقاء کی اس جنگ میں آخری فتح انشاء اللہ ہماری ہوگی"۔ صرف ایک دن میں آپ بھول گئے کہ قوم کے ساتھ آپ نے کتنا بڑا عہد کیا تھا۔ ہائے، میرے وطن کے کیسے کیسے جیالے گلیوں اور بازاروں میں سر نیہوڑائے پھرتے ہوں گے۔ ہائے میرے دیس کے جی داروں کو یہ ذلت بھی دیکھنا تھی۔ غیرتوں کے علم یوں سرنگوں ہونے تھے۔ ہنستے مسکراتے جان پر کھیل جانے والوں کی گردنیں یوں جھکنا تھیں۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر حرمتوں کی حفاظت کرنے والے اس تذلیل کے زہر کو کیسے پی گئے ہوں گے؟ سوچتا ہوں میرے پاکستان کے بھولے عوام کب تک سرمایہ داروں کی جنگوں کا ایندھن بنتے رہیں گے کب تک ان کا جوان خون تاشقندوں میں نیلام ہوتا رہے گا۔ کب تک خان، چوہدری، مسٹر اور مولانا ان کی تقدیروں سے کھیلتے رہیں گے۔ کب تک سرمائے کا اژدہا ان کا خون چوستا اور ہڈیاں چباتا رہے گا۔ وہ روشن صبح کب طلوع ہوگی۔ جب وہ صرف اپنی لڑائی لڑیں گے۔ وہ سورج کب چڑھے گا جب قومی دشمن کے خلاف عوامی جنگ کی قیادت ان کے اپنے ہاتھ میں ہوگی۔

قارئین کرام! معافی چاہتا ہوں، جب لکھنے بیٹھا تھا تو وہم تک نہیں تھا کہ قلم یوں بے لگام ہو کر سرپٹ بھاگ نکلے گا۔ میری روح کے کرب کی طنابیں ٹوٹ گئی ہیں۔ وہ گھروندے نہیں بھولتے جو بے چراغ ہو گئے ہیں۔ ہائے ان بیبیوں کو کیسے فراموش کر دوں جن کی چوڑیوں کی کرچیاں کلائیوں کو لہولہان کر گئی ہیں اور جن کی سیندور والی مانگ میں خاک بھر گئی ہے۔ ان ماں باپ کے بارے میں کیوں نہ سوچوں جن کے بڑھاپے یتیم ہو گئے ہیں، جو بن آئی موت مر گئے ہیں۔ ان بہنوں کو کیا جواب دوں جن کے سارے مان ٹوٹ گئے ہیں۔ ان پھولوں کی طرح مہکنے والے بچوں سے کیسے نظریں پھیر لوں جو سونی گلیوں کے خس و خاشاک کی طرح مصائب کی آندھیوں کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔

وہ صبح کب طلوع ہوگی

جب پاکستانی عوام

اپنی جنگ لڑیں گے

قارئین کرام! سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں۔ اس جنگ اور اس کے انجام نے سارے زخم ہرے کر دیے ہیں۔ سب داغوں کو زبان دے دی ہے۔ کیسے بھول جاؤں کہ میرے وطن میں ارباب اقتدار کو عوام صرف اسی وقت یاد آتے ہیں جب ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ان کی بھوک کو استحصالی "اخلاق" اور سرمایہ دارانہ "قسمت" کی لوری دے کر سلانا ہوتا ہے۔ جب ان سے ہر آن بڑھتے ہوئے ظلم کو خاموشی سے سہہ جانے کا مطالبہ کرنا ہوتا ہے۔ جب ان کے پاک خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں ایسے میں کبھی سال یا دو چار سال کے بعد ایک آدھ دفعہ ان کے ساتھ "برادران وطن" اور "غازیان اسلام" کی رشتہ داری قائم کر لی جاتی ہے۔ لیکن جب یہی عوام شرمناک زندگی کی اذیت سے بلبلا اٹھتے ہیں اور محض زندہ رہنے کا معمولی سا حق مانگتے ہیں۔ تو سرکار دربار سے شرپسند، تخریب کار، بیرونی ایجنٹ، اسلام دشمن، وطن فروش آزادی اور جمہوریت کے دشمن اور پتہ نہیں کیا کیا خطاب پاتے ہیں۔ ان سے جیلوں کی رونق بڑھائی جاتی ہے۔ انہیں سڑکوں اور بازاروں میں لاٹھیوں سے پیٹا جاتا ہے۔ اذیت خانوں میں ان کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے اور سنسناتی گولیوں سے ان کے سینے چھلنی کر کے اپنی جابریت اور قہاری کی دھاک بٹھائی جاتی ہے۔

بالکل بجا کہ وطن کی حفاظت ہر پاکستانی کا ایمان ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ بھارتی جارحیت کی کلائی مروڑنے کے لئے رجعت پسند حکمرانوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونا بھی عین اصول ہے۔ لیکن اس کی اجازت کیوں ہو کہ ہر ایوب خان اور یحییٰ خان تو شہیدوں کے خون کی قیمت چکا کر محل نما ایئر کنڈیشنڈ کوٹھی کی زینت بن جائے لیکن وطن کی آن پر پروانوں کی طرح مر مٹنے والوں کو کفن نصیب ہو سکے نہ قبر۔ اور یہی لوگ خود پس منظر میں ہٹ کر اپنے ہی بیٹوں بھتیجوں کو ہم پر حکومت کرنے کے لئے آگے بڑھا دیں۔

آج حالات نے پاکستان کے عوام کو اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں انہیں قطعیت کے ساتھ فیصلہ کرنا ہوگا کہ انہیں کس کی خاطر اور کس اسلوب سے زندہ رہنا ہے۔ خود حکمرانوں کے لئے بھی یہ وقت لمحہ فکریہ ہے۔ یہ وہ فیصلہ کن گھڑی ہے جب انہیں بغیر لگی لپٹی کے عوام کے سامنے اعلان کرنا ہے کہ انہوں نے عزت کے ساتھ جینے کا فیصلہ کیا ہے یا اطاعت گزاری اور ذلت کو مجبوری سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ اگر انہوں نے قومی عزت کی راہ کو منتخب کیا ہے تو پھر عوام یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جا رہے ہیں۔ اور کیا لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے۔ اس صورت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ عوام کو اعتماد میں لیا جائے۔ ان پر مکمل بھروسہ کیا جائے۔ انہیں منظم و متحرک کیا جائے۔ انہیں مسلح کیا جائے اور فوجی تربیت دی جائے اور ساری قوم کو وطن کے دفاع کے لئے ایک ناقابل تسخیر قوت میں ڈھال دیا جائے۔

آج پاکستان کا دفاع عظیم عوامی فوج کے قیام کے ساتھ مشروط ہو چکا ہے۔



چانگ - تین - ای

قیصر سلیم

ایک چینی لوک کہانی

چھوٹو اور موٹو

کسی زمانے میں کسی جگہ ایک غریب کسان اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے، وہ اتنے بوڑھے ہو چکے تھے۔ کہ اب انہیں اپنی عمر بھی یاد نہیں رہی تھی۔ اس بڑھاپے میں ہی ایک دن اللہ تعالےٰ نے انہیں دو چاند جیسے بچے عطا کئے، بوڑھا کسان خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اس بڑھاپے میں آخر کار تو نے ایک نہیں، دو بیٹے دے دیئے۔

اس کی بیوی بھی بے حد خوش ہوئی اور بولی۔

"اب ان کا کوئی اچھا سا نام رکھ دو"،

کیا نام رکھے جائیں؟ بڈھے نے تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ گھر میں جو پھٹی پرانی کتاب پڑی ہوئی ہے کیوں نہ اس میں نام ڈھونڈے جائیں، ٹھیک ہے۔ ورق الٹتے ہی جو لفظ پہلے ملے گا وہی چن لیا جائے گا۔

ایک، دو، تین۔ پہلا لفظ گوبھی ملا۔ تو کیا۔ بڑی گوبھی اور چھوٹی گوبھی ٹھیک رہے گا؟ ہونہہ! بڈھا بڑبڑایا۔ کھانے کو تو چاول ملتے نہیں۔ صرف گوبھی سے کیا ہو گا؟"

پھر اس نے ایک اور ورق الٹا۔ اس مرتبہ پہلا لفظ "موٹا" ملا اور اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ کتاب اور آنکھیں ایک ساتھ بند کر کے اس نے سوچا۔ موٹا۔ ہاں۔ لوٹا۔ سوٹا۔ چھوٹا۔ ٹھیک ہے۔ موٹا اور چھوٹا۔ چھوٹا اور موٹا۔ لیکن نہیں۔ انہیں اس طرح کر دو۔ چھوٹو اور موٹو۔ بالکل ٹھیک۔

اس طرح ایک کا نام چھوٹو اور دوسرے کا نام موٹو رکھا گیا

دس سال بعد ایک روز دونوں میاں بیوی مر گئے، مرنے سے پہلے انہوں نے چھوٹو اور موٹو کو بلا کر کہا۔" ہم کوئی کھیت زمین یا جائیداد تمہارے لئے نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ اس لئے باہر نکل کر کام ڈھونڈھنا شروع کر دو، ہم جب مر جائیں تو گھر کے پچھواڑے ہمیں لے کر رکھ دینا۔ کوے ہمارے لئے قبریں کھود دیں گے جس طرح انہوں نے حضرت آدمؑ کے بیٹے کے لئے کھود کر بتایا تھا۔ تم ہمیں دفن کرنے کے بعد کہیں دور نکل جانا۔"

چنانچہ موٹو اور چھوٹو اپنے ماں باپ کے جنازے کو پہاڑی پر لے کر جونہی نماز ادا کرنے کھڑے ہوئے۔ درختوں کے تمام کوے کائیں کائیں کرتے ہوئے آ پہنچے اور انہوں نے اپنی چونچ سے گڑھے کھودنا شروع کر دیئے۔ ہزاروں لاکھوں کوے تھے۔ اس لئے جلد ہی دو قبریں تیار ہو گئیں اور انہیں دفنانے کے بعد چھوٹو نے موٹو سے کہا۔

"چلو جلدی، یہاں سے جانے کی تیاری کریں۔"

گھر پہنچ کر دونوں نے ایک تھیلے میں چاول بھرے اور دوسرے تھیلے میں کچھ برتن اور پھٹے پرانے کپڑے ڈالے اور خوشی خوشی چل پڑے۔

"اب کہاں جائیں گے ہم؟" موٹو نے پوچھا۔

اور واقعی انہیں یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ کہاں جائیں گے یہ سوچ کر دونوں بیٹھ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

آس پاس کی جتنی پہاڑیاں تھیں، جتنے کھیت تھے اور جتنے درخت تھے۔ سب کے سب دوسرے کے تھے۔ وہ یہی سوچتے رہے کہ کس طرف کا راستہ اختیار کریں کہ شام ہو گئی، سورج بھی پہاڑیوں کے پیچھے سوتے چلا گیا، چاند نکل آیا۔ اور تارے جھلملانے لگے

دونوں بھائیوں نے رونا شروع کر دیا۔ رو رو کر ساری رات گذار دی اور پھر سورج آنکھیں ملتا ہوا مشرقی آسمان پر نمودار ہوا، سورج کے چہرے پر اس مرتبہ مسکراہٹ تھی، چھوٹو نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بولا،

"کیا اسی طرح روتے رہو گے؟ میں تو اب رونا بند کرتا ہوں"

"ٹھیک ہے میں بھی روتے روتے تھک گیا ہوں"، موٹو نے کہا۔" چلو اب چلیں"

راستے کا دونوں کو پتہ نہیں تھا۔ ایک طرف کو چل پڑے چلتے گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ چلتے گئے۔ یہاں تک کہ تمام چاول جو وہ لے کر چلے تھے ختم ہو گئے۔

"اب تو کھانے کو بھی کچھ نہیں رہا ہے۔ کیا کریں بھائی چھوٹو" موٹو نے پوچھا۔

"اب بیٹھ کر ذرا آرام کریں پھر نکلیں گے، کھانے کی تلاش میں"، چھوٹو نے کہا۔

دونوں ایک سیاہ پہاڑی کے دامن میں بیٹھ گئے، موٹو نے خالی تھیلے کو دیکھ کر آہ بھری اور بولا۔

"میں بڑا ہو کر ضرور دولت مند بنوں گا۔ دولت والوں کے پاس کھانے کو بھی بہت ہوتا ہے اور کپڑے بھی بہت ہوتے ہیں اور پھر یہ کہ انہیں کام بھی نہیں کرنا پڑتا ہے"۔

"لیکن ابا نے تو کام کرنے کی تاکید کی تھی"۔ چھوٹو نے کہا

"اس لئے کہ ابا غریب آدمی تھے۔ امیروں کو تو کام کی ضرورت ہی نہیں ہوتی" موٹو نے کہا۔

"ابا اور اماں دونوں غریب تھے۔ لیکن بڑے اچھے تھے۔ امیروں سے بھی اچھے تھے" چھوٹو نے کہا۔

"لیکن امیروں کا وقت اچھا گذرتا ہے۔ موٹو نے جھنجھتے ہوئے کہا۔ غریب کو تو سوائے کام کے کوئی تفریح ہی نہیں سوجھتی" اتنے میں ایک گرجدار آواز گونجی۔

"میں تم دونوں کو کھا جاؤں گا"

دونوں خوف سے زمین پر اوندھے منہ گر پڑے اور تھر تھر کانپنے لگے۔

"کون گرجا تھا؟ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ دونوں بھائی اُٹھ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے موٹو نے آہستہ سے پوچھا" کس کی آواز تھی؟"

"پتہ نہیں"

اور انہیں جلد ہی پتہ چل گیا اس لئے کہ سیاہ پہاڑی اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگی۔

"بھاگو زلزلہ آ گیا" موٹو نے چیختے ہوئے کہا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ دور بھاگتے۔ پہاڑی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

یہ ایک آدم خور دیو تھا جو ایک مدت سے سویا ہوا تھا اور جسے یہ دونوں لڑکے پہاڑی سمجھ کر دامن میں آ کر بیٹھ گئے تھے

الفتح

دیو کھڑا ہو چکا تھا اس کی آنکھوں سے نیلی روشنی باہر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ دونوں بھائیوں کو پکڑنے کے لئے بڑھانے شروع کر دیئے۔

او خدایا! موٹو اور چھوٹو کو یہ بھوتنا ہڑپ کر جائے گا۔ موٹو نے سوچا۔ "ابا اماں مر گئے، کھانے کو کچھ نہیں رہا اب نہ پیسہ ہے، نہ زمین ہے۔ اس دنیا میں تو پھر ٹھیک ہے۔ کھا لینے دو۔"

چھوٹو بڑا فکرمند تھا۔ لیکن وہ کس طرح سے بھاگ سکتا تھا۔ دیو کے بازو اتنے لمبے ہیں کہ وہ ایک میل بھی دوڑ جائے تب بھی نہیں بچ سکتا۔

دیو نے جب ان دونوں لڑکوں کی بے بسی دیکھی تو ہنسنے لگا

"کیا سچ مچ تم ہمیں کھا جاؤ گے"؟ چھوٹو نے پوچھا۔

ہاں، یا پھر کچھ ہیرے جواہر دو یا روپے لاؤ۔

"ہیرے جواہر کیا ہوتے ہیں۔ ہم نے تو کبھی دیکھے ہی نہیں"

"ہاہا! یہ تو بری بات ہے۔"

چھوٹو نے موٹو سے کانا پھوسی کی۔ "چلو بھاگ چلیں"۔

"وہ ہمیں پکڑ لے گا۔ موٹو نے کہا۔

ہم دونوں الٹے رُخ بھاگیں گے پھر نہیں پکڑ سکے گا۔ چھوٹو نے کہا۔

"ایک، دو، تین!" چھوٹو پورب کو بھاگا اور موٹو پچھم کو دیو نے دونوں کو ایک ساتھ پکڑنا چاہا۔ کبھی پورب کی طرف چند قدم چلتا تو کبھی پچھم کی سمت چند قدم کھسکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کسی کو بھی نہ پکڑ سکا۔

اس طرح موٹو اور چھوٹو بھاگ نکلے، ان کے تھیلے وہیں زمین پر پڑے تھے۔ دیو نے غصے میں آ کر ان تھیلوں ہی کو منہ میں ٹھونس لیا لیکن اس کا منہ اتنا بڑا تھا کہ تھیلے اس کے دانتوں میں ہی پھنس کر رہ گئے۔ چنانچہ اسے ایک درخت کی شاخ توڑ کر اپنے دانتوں کی صفائی کرنی پڑی۔

پھر دیو نے سونے کا ارادہ کیا۔

آسمان پر ہلالی چاند اوپر اُٹھ چکا تھا۔ دیو نے جمائی لی۔ ہاتھ پیر کھینچے اور ایک ہاتھ کو چاند کی نوک سے کھجلاتے ہوئے آخ تھو کیا اور بولا۔۔ آج کا دن بڑا واہیات رہا۔"

(۲)

چھوٹو چھ سات میل تک دوڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ ایک وادی آ گئی اور جب اطمینان کر لیا کہ دیو پیچھا نہیں کر رہا ہے تو وہ دم لینے کے لئے رک گیا۔

"موٹو، موٹو!" وہ چلایا۔

لیکن اس کا بھائی تو مخالف سمت میں دوڑا تھا۔ وہ بھی کہیں نہ کہیں پہنچ ہی گیا ہو گا۔ چھوٹو نے آنکھیں ملیں اور رونے کی کوشش کی لیکن اُس سے رویا نہ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آخر گھاس پر لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

چھوٹو کو سوئے ہوئے ابھی چند گھنٹے گزرے تھے کہ دو حیوان نما آدمی آ دھمکے، ایک کی شکل و شباہت کتے جیسی تھی۔ اس کا نام سگباش تھا اور دوسرا جو لومڑی نما تھا۔ اس کا نام ۔۔؟ چلو لومڑ ہی کہہ لو۔ لباس تو دونوں ہی کا عمدہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن لومڑ کی ٹوپی بڑی شاندار تھی، جیسے چاندی کو کوٹ کر بنائی گئی ہو۔

"آج اچھی چیز ہاتھ لگ گئی"۔ سگباش نے لومڑ سے کہا۔ "ایک چمڑے کا تھیلا مل گیا۔"

"کیا ہے اس میں"؟

"تم نہیں بوجھ سکتے۔ اس میں مکھیاں بھری ہیں"۔

"بس مکھیاں! یہ تو کوئی خاص چیز نہیں ہوئی"۔ لومڑ نے کہا

"پھر مسٹر لومڑ" سگباش بولا "تمہاری عقل کے مطابق کون سی چیز خاص ہوتی ہے"؟

"ارے کوئی لڑکا وڑکا مل جائے تو کوئی بات ہے"۔

"اچھا! تو پھر آج ڈھونڈھ کر ہی رہوں گا"۔

دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے چھوٹو کے قریب پہنچ گئے۔ سگباش نے جب چھوٹو کو دیکھا تو خوشی سے اُچھل پڑا۔

"مسٹر لومڑ! مسٹر لومڑ! میں نے کہا تھا نا کہ ڈھونڈھ کر رہوں گا۔ ہاہا۔ یہ رہا لڑکا۔"

لومڑ نے اپنے گالوں کی کھجلی کی اور رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ سگباش نے سوئے ہوئے چھوٹو کو اُٹھا کر کندھے پر رکھ لیا

"کہو، کتنے دام لگیں گے اس کے مسٹر لومڑ؟"

چھوٹو ابھی پوری طرح جاگا نہیں تھا۔ نیند میں ہی بڑبڑایا "اُوہو، شور نہ کرو، سونے دو مجھے"۔

سگباش نے قہقہہ لگایا۔ "واہ رے لونڈے شور کی شکایت کرتا ہے، تجھے تو میں نے زمین سے پایا ہے اور اب تو میری ملکیت ہے"

چھوٹو جاگ پڑا اور اُسے خطرے کا احساس ہو گیا بولا "کیا بکتے ہو؟ میں تو چپ چاپ سویا ہوا تھا۔ تمہارا اس میں کیا دخل؟"

"کیا اور کیسے کو چھوڑو، آسان سی بات ہے کہ میں نے تمہیں پایا ہے"۔

"پانے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہاری ملکیت تو نہیں بن گیا"۔

"بے شک بن گئے۔ ان سے پوچھو اگر مجھ پر یقین نہیں ہے" سگباش نے لومڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لومڑ نے جھک کر تصدیق کی اور وہ اتنا جھکا کہ پیشانی زمین سے جا لگی۔

یہاں کا یہی قانون ہے۔ اُس نے کہا۔ "جو جس کو پا لیتا ہے وہی اس کا مالک بن جاتا ہے۔ اب چونکہ مسٹر سگباش نے تمہیں زمین پر گرا ہوا پایا اور اُٹھا لیا تو اب تم کس طرح انکار کر سکتے ہو کہ تم اس کی ملکیت نہیں ہو"۔

چھوٹو نے اپنی آنکھیں ملیں اور پہلے سگباش کو دیکھا پھر لومڑ کی طرف نگاہ کی اور بولا "یہ غلط ہے۔ بالکل غلط"۔ "ایسا کوئی قانون نہیں ہے۔ تم سب جھوٹ بولتے ہو"۔

"تم مانو یا نہ مانو، کوئی فرق نہیں پڑتا"۔ سگباش نے کہا۔ "یہ تو ملک کا قانون ہے۔ میں نے تمہیں پایا ہے اس لئے تم میرے ہو، یا پھر ایک ہزار سونے کی اینٹیں دو تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے"۔

چھوٹو نے جان چھڑانے کی بے حد کوشش کی لیکن ناکام رہا سگباش بڑا طاقتور تھا۔ اس نے اپنی گرفت مضبوط رکھی۔

"میں تمہارا نہیں ہوں!" چھوٹو نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ "اور میرے پاس کوئی سونے کی اینٹ نہیں ہے۔ تم لوگ ظالم ہو۔ کوئی قانون ایسا نہیں ہے۔ مکار ہو تم دونوں"۔

"چلو ساتھ لئے چلتا ہوں، پھر دیکھنا کہ قانون ہے یا نہیں ہے"

"چلو بادشاہ کے پاس"۔ چھوٹو نے کہا۔

"بہت بہتر، چلو"۔

سگباش چھوٹو کو کندھے پر اٹھائے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔

"بہت بہت شکریہ مسٹر سگباش"۔ "مسٹر سگباش۔ چھوٹو بولا۔ تم اگر کندھے پر نہ چڑھاتے تو میں اتنا لمبا راستہ طے نہیں کر سکتا تھا۔ بہت تھکا ہوا ہوں"۔

سگباش اگرچہ طاقتور تھا۔ لیکن ایک دو میل چلنے کے بعد اس کے بازوؤں میں درد ہونے لگا اور اس نے گرفت ڈھیلی کر دی

"کیا میں بہت بھاری ہوں مسٹر سگباش؟" چھوٹو نے بڑے ادب سے پوچھا۔ "لاؤ میں خود ہی چل لیتا ہوں"۔

"ٹھیک ہے"۔

جوں ہی سگباش نے چھوٹو کو کندھے سے اُتار کر چھوڑا چھوٹو ایک دو تین ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو گیا۔

لومڑ نے حیرت سے اپنی ٹوپی ہوا میں اُچھال دی جو چاند کی ایک نوک پر جا اٹکی اور لومڑ افسوس کے ساتھ ہاتھ ملنے لگا۔

"ہائے میری ٹوپی"۔

لیکن سگباش کو ٹوپی کی فکر سے زیادہ چھوٹو کی فکر عزیز تھی، وہ چھوٹو کے پیچھے دوڑا اور اتنا تیز دوڑا کہ اس کے پیچھے چھوٹو سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر رہ گئے اور پھر اور نزدیک۔ صرف چھ انچ۔

"دوڑو۔ اور تیز" چھوٹو نے پھر ہمت کی لیکن اب تو سگباش کے پنجے صرف ایک انچ دور رہ گئے۔ چاند بھی اپنی نوک پر لومڑ کی ٹوپی لٹکائے چھوٹو کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔

آخر کار سگباش کے پنجوں نے چھوٹو کے کندھوں کو جا پکڑا اور اس نے پھر چھوٹو کو اٹھا لیا۔

"تم تو اچھی دوڑ لگا لیتے ہو"۔ چھوٹو نے ہانپتے ہوئے کہا۔

الفتح

"چھوڑو، یہ کیوں اور کیسے چپ چاپ بادشاہ کے پاس چلو اور پوچھو کہ تم میری ملکیت ہو یا نہیں۔"

سگباش چھوٹو کو گھسیٹتا لے چلا، چاند بھی ٹوپی لٹکائے ان کے ساتھ تھا۔ لومڑ اب تک آہیں بھر رہا تھا۔

"ہائے رے میری روپہلی ٹوپی۔"

"کیا شور مچا رہے ہو، ٹوپی ٹوپی"۔ سگباش نے بے صبری سے کہا۔ چاند کو پورا ہو جانے دو، ٹوپی خود ہی گر پڑے گی۔ دو ہفتوں کی تو بات ہے کیا اتنا بھی انتظار نہیں کر سکتے؟"

"اچھی بات ہے۔ خدا حافظ"۔ لومڑ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے۔ کہا "تم جاؤ۔ میں یہیں انتظار کروں گا۔"

چھوٹو اور سگباش دارالحکومت کے لئے روانہ ہو گئے شہر کے دروازے تک پہنچنے میں انہیں دو گھنٹے لگ گئے۔ سگباش نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

"دروازہ کھولو" وہ چلایا۔

بادشاہ ابھی ابھی بستر میں گیا تھا اس نے جب آواز سنی تو بڑا جھنجھلایا۔ اتنی رات گئے یہ کون آدھمکا۔ لیکن وہ چونکہ بادشاہ تھا اس لئے اسے فریاد سننے کے لئے اٹھنا ہی پڑا، وہ بہت بوڑھا تھا۔ ایک ہاتھ میں شمع دان لئے دروازے کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اتنے میں اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ شمع بجھ گئی۔ سگباش انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔ "عجیب طرح کے بادشاہ ہو! دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟"

"آرہا ہوں۔ آرہا ہوں۔ ذرا موم بتی جلا لوں ـــ اُف کیا مصیبت ہے۔"

ایک گھنٹے بعد۔ بادشاہ نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ "کیا ہے"

سگباش نے جھک کر کورنش بجایا اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا چھوٹو نے بولنا شروع کر دیا۔

"میں زمین پر سویا ہوا تھا۔ کہیں سے مسٹر سگباش آیا اور پھر اس نے مجھے اوپر اٹھا لیا۔ اور پھر کہا کہ میں اس کی ملکیت ہوں میں نے انکار کیا پھر ہم آپ سے انصاف کرانے آگئے۔"

"پھر کیا ہوا"۔ بادشاہ نے پوچھا۔

"پھر ہم آکر دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ پھر آپ گر پڑے بادشاہ سلامت، پھر آپ رونے لگے بادشاہ سلامت۔"

بادشاہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "میں نہیں رویا۔"

"عالم پناہ"! سگباش نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔ کیا ایسا قانون نہیں ہے کہ سگباش اگر چھوٹو کو اٹھا لے تو چھوٹو سگباش کی ملکیت ہو جائے گا؟"

"نہیں"! چھوٹو نے چیختے ہوئے کہا۔

"شور مت مچاؤ"۔ سگباش بولا "ہم بادشاہ سلامت سے دریافت کر رہے ہیں۔ حضور، جلد فیصلہ صادر فرمائیں۔"

بادشاہ نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سگباش ٹھیک کہتا ہے۔ چھوٹو اسی کی ملکیت ہے۔۔۔؟"

"میں نہیں مانتا" چھوٹو پھر چلایا

"مانو یا نہ مانو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

بادشاہ نے جیب سے قانون کی کتاب نکالی اور موم بتی کی روشنی میں ورق الٹنے شروع کر دیئے۔ کافی دیر بعد اسے وہ دفعہ مل گئی جسے وہ اتنی دیر سے تلاش کر رہا تھا۔

"یہ دیکھو چھوٹو"۔ بادشاہ نے کہا۔ یہ ہمارے قانون کی کتاب ہے۔ اڑتیس ہزار آٹھ سو چونسٹھویں قانون میں درج ہے۔

"اگر سگباش چھوٹو کو زمین پر پڑا ہوا پا لیتا ہے تو چھوٹو سگباش کی ملکیت قرار پائے گا۔"

اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ ملکی قانون میں یہی لکھا ہوا تھا۔

"اب کہو" سگباش نے چھوٹو سے کہا۔

"چلو اب چلتا ہوں تمہارے ساتھ" لیکن چھوٹو بادشاہ سے بے حد خفا تھا۔ چیختے ہوئے کہنے لگا۔

"تم ضرور روتے تھے بادشاہ"

"تم احمق ہو"

"تمہاری ناک لال ہے"

"تم بلّی ہو"

"چمگادڑ ہو"

"چوہا ہو تم"

"سگباش نے سر کو جھٹکا دیا" یہ کوئی اچھی نظم نہیں ہے"

پھر وہ ایک مرتبہ جھک کر کورنش بجا لایا اور بولا۔

"عالم پناہ آپ کا بے حد شکریہ"۔

چنانچہ سگباش چھوٹو کو پھر ساتھ لے چلا۔ بادشاہ دروازہ بند کرنے لگا تھا کہ اسے کوئی بات یاد آگئی۔

"سگباش"۔ اس نے آواز دی۔ "ذرا پکوڑے والا ملے تو اسے بھیج دینا۔ پکوڑوں کی خواہش ہو رہی ہے۔"

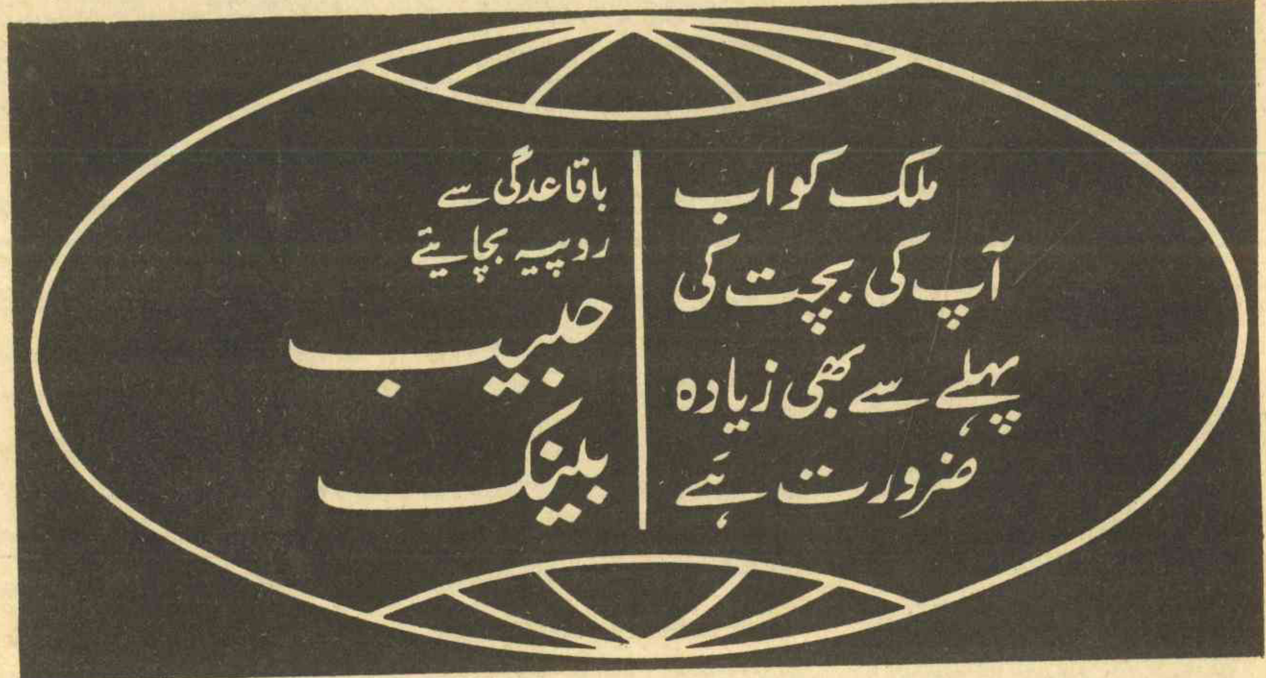
"بہتر عالم پناہ"

اگر پکوڑے نہ ہوں تو سموسے ہی ٹھیک رہیں گے۔"

"بہت اچھا عالم پناہ"

"اور پیسے بھی میری طرف سے دے دینا۔ کیوں سگباش"

"بہت بہتر عالم پناہ"



عنایت اللہ نے بازاری صحافت کا آغاز کیا

یحییٰ خاں کی عیاشیاں نہیں

اصل حقائق بتائیے

عابد زبیری

قوم کو المناک شکست اور ناقابل فراموش المیہ سے دوچار ہونا پڑا۔ آیئے ہم ان حقائق کا جائزہ لیں جو اس المیے کا سبب بنے
آج قوم یہ پوچھ رہی ہے کہ اس المیہ کا ذمہ دار کون ہے؟
یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ المیہ ایک دن یا ایک شب میں پیش نہیں آیا۔ اس المیے کی علامات بہت پہلے ظاہر ہو چکی تھیں، حالات اس المیے کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اور یقیناً بعض افراد حالات سے بخوبی باخبر تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان افراد نے ان حقائق کو پوشیدہ کیوں رکھا۔ کیا ان میں ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا۔ کہ وہ اپنے دل میں قوم کا درد محسوس کرتا، اس کا دل ملک اور قوم کے لئے دھڑکتا اور اس میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہوتا کہ وہ قوم کو اس حادثے سے آگاہ کرتا جو کچھ عرصہ کے بعد رونما ہونے والا تھا۔

سیکرٹریٹ کے ناخدا، سیکرٹریٹ کے اعلیٰ حکام، اعلیٰ افسر، نوکر شاہی، اعلیٰ صحافی اور بڑے صنعت کار تمام حقائق یا چند حقائق ضرور جانتے تھے، وہ مشرقی پاکستان کے اکثر و بیشتر" دورے کرتے تھے وہاں کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کے پاس اطلاعات حاصل کرنے کے وسیع ذرائع تھے۔ لیکن قوم کو ایک بھی حق گو ایسا نہ ملا جو وقت پر حقائق بتاتا۔

۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں نے عنان حکومت سنبھالی۔ تو اس نے تمام سیاسی رہنماؤں پر پابندی لگادی۔ سیاسی سرگرمیاں ختم کردی گئیں تاکہ عوام کو اس مکروہ، ملک اور عوام دشمن سازش کا علم نہ ہوسکے جس کے بل بوتے پر وہ کرسی اقتدار پر فائز ہوا تھا۔
ایوبی دور کا آغاز سیاست دانوں پر الزام تراشی سے شروع ہوا۔ قوم کے تمام اخبارات اور تمام نام نہاد صحافیوں نے، جنہیں حکومت نے خرید لیا تھا، سیاستدانوں کے کردار پر کیچڑ اچھالنا شروع کردی اور ایک ایسا ماحول پیدا کردیا کہ عرصہ دراز تک عوام یہ پوچھنا بھول گئے کہ حضور آپ نے کس طرح حکومت سنبھالی اور آئندہ کیا ہوگا۔ ایوبی دور حکومت میں صحافیوں کو وزارت اور اعلیٰ عہدوں کی رشوت دی گئی، مدیر ڈان الطاف حسین کو وزارت صنعت دور ایوبی سے عطا ہوئی، زیڈ اے سلہری، کرنل سلہری بنا دیئے گئے، اور ملٹری انٹیلی جنس میں جنرل عمر کی سربراہی میں حکومت کا حق نمک ادا کرنے لگے۔
صحافیوں کے اس گمراہ گروہ نے ہر موقع پر صحافتی اصولوں اور عوام دوستی کو نظر انداز کیا، اور صحافت کو کاروبار بنا دیا۔ ایوبی دور ہی میں عنایت اللہ نے بازاری صحافت کا آغاز کیا۔ جب عوام نے ایوب کے خلاف صف آرائی کی تو ان ہی نام نہاد دانش وروں نے عوام دشمنی کا کردار اس طرح ادا کیا کہ اقتدار یحییٰ خاں کے ہتھے چڑھ گیا۔ یحییٰ خاں نے بھی ایوبی پالیسی کو اپنایا۔ اخبارات، رسالے اور ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع اسے جمہوریت کا سب سے بڑا نجات دہندہ کے روپ میں پیش کرتے رہے۔ عوام کو جھوٹی سچی کہانیاں سناتے رہے اور ایوبی حکومت سے وابستہ افراد پر الزام در الزام لگاتے رہے، اور حقائق پر پردہ ڈالتے رہے ان میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ بتاتے کہ بحالی جمہوریت کی تحریک کو کس نے سبوتاژ کیا۔ ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع نے عوام کو ضمنی مسائل میں الجھائے رکھا۔

یحییٰ خان اور اس کے حواری عورتوں کی صحبت سے کس طرح لطف اٹھاتے تھے اور شراب کے نشے میں بدمست ہوکر کیسی عیاشیاں کرتے تھے؟ صرف یہی چیز قوم کی شکست، ذلت اسے تاریکی کی عمیق گہرائیوں اور پاکستان کی بنیادیں کمزور کرنے کا سبب نہیں بنی۔
یہ ملک دشمن سازش کیا تھی، اس میں کون ملوث تھے؟ عوام اس سے باخبر ہونا چاہتے ہیں۔ وہ حقائق جاننے کے لئے بےچین اور اضطراب ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تمام اخبارات یحییٰ خاں اور اس کے چالیس چوروں کی کہانیوں اور قصوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اصلی سازش کو اب بھی عوام سے پوشیدہ رکھا جارہا ہے۔
قوم کو "حکمرانوں" کی عیاشیوں سے کوئی دلچسپی نہیں، بلکہ وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ اس سازش میں یحییٰ خاں کا کیا کردار تھا؟ اس کے حواریوں نے کیا رول ادا کیا۔ جن کے سبب ہتھیار ڈالنے پڑے اور ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔
میں تمام نہاد بڑے صحافیوں پر اس سازش میں ملوث ہونے کا الزام لگاتا ہوں وہ جان بوجھ کر دانستہ یا نادانستہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سازش کا حصہ بنتے رہے، ہر صحافی خاص طور پر وہ جو اپنے آپ کو بڑا صحافی اور دانش ور کہلاتے ہیں حقائق سے باخبر تھے۔ یا پھر وہ اتنے دانش ور نہیں کہ وہ حالات کا تجزیہ کرسکیں۔ اس قبیل کے اعلیٰ صحافی غیر ملکی پریس میں شائع ہونے والی اطلاعات سے بھی آگاہ تھے۔ حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود انہوں نے عوام کو اصل واقعات بتانے کی زحمت گوارہ کیوں نہ کی اور یہ کیوں نہ بتایا کہ اگر یحییٰ خاں اور اس کے ٹولے کو محروم اقتدار نہ کیا گیا تو ملک تباہ و برباد اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ وہ یہ بہانہ بنا کر پریس پر پابندی تھی، یا پریس کے مالکان سرمایہ دار تھے، اس الزام سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے۔ اس سلسلے میں میں اتنا عرض کروں گا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں اخبارات کے مالک سرمایہ دار ہی ہوتے ہیں اشتراکی نہیں، پوری دنیا میں اخبارات پر پابندیاں ہیں اور تمام حکومتیں اپنے عوام سے حقائق کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن ایک صحافی۔ حق گو اور سچا صحافی، جو آزادی صحافت پر ایمان رکھتا ہے، بلا خوف و خطر عوام کو حقائق سے آگاہ کرتا ہے کیونکہ یہ اس کا فرض ہے اور اسی مقدس فرض کی ادائیگی کی وجہ سے عوام اس کی عزت کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں صحافت کے ان مسلمہ اصولوں سے غداری کی گئی، نام نہاد اعلیٰ صحافی عوام کو اعتماد میں لینے میں ناکام ہوگئے اور اپنے مفادات کے لئے وہ عوام دشمن اور ملک دشمن عناصر کے ہمنوا بن گئے۔

میں یہ الزام بھی لگاتا ہوں کہ اب ایک منظم منصوبے کے تحت عوام کی توجہ اصل سازش سے ہٹا کر یحییٰ خاں کی عیاشیوں کی جانب مبذول کر رہے ہیں۔ یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کی داستان رنگین عورتوں سے ملاقاتیں اور عیش و عشرت کے قصے رنگینی بیان اور حاشیہ آرائی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں تاکہ عوام اصل سازش کو بھول جائیں، عوام ملک دشمن سازش کے حقائق جاننا چاہتے ہیں اس لئے ان صحافیوں سے میں یہ عرض کروں گا کہ وہ ہمیں حقائق سے آگاہ کریں۔
"الفتح" کو جب بھی کوئی خبر ملی، اس نے بلا خوف و خطر اس خبر کو شائع کیا، اسے جب بھی کسی واقعہ کا علم ہوا تو حکومت کی عتاب کی پرواہ کئے بغیر نذر قارئین کیا۔ کیونکہ "الفتح" سود و زیاں کے پیمانے توڑ چکا تھا۔ عوام کو آگاہ کرنے کے صلے میں "الفتح" پر طرح طرح کے عتاب نازل ہوئے "الفتح" پر بغاوت، کے الزام میں

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

پیپلز گارڈ کے سالار امان اللہ سے ایک ملاقات





سانگھڑ میں حملے کے وقت سب سے آگے امان اللہ تھا

وہاب صدیقی

۱۹۶۸ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ ایوبی آمریت، جاگیرداروں سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے خلاف ملوں، کھیتوں، درسگاہوں بازاروں اور گلی کوچوں میں عوامی جد و جہد کا آغاز ہو چکا تھا ایوبی قلعے کا گھیراؤ ہو چکا تھا۔ پتھراؤ جاری تھا۔ مسٹر بھٹو سیاسی افق پر ایوبی حکومت کے خلاف تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ اس دور میں بھٹو صاحب کے "دوست اور احباب" بھی ان سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ بقول مسٹر بھٹو "جس ہوٹل میں قیام کرتے ہمارے دوست اس ہوٹل کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے"۔ اس دور میں مسٹر بھٹو کی حمایت اور ہمنوائی کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ان کے حامی حکومت اور رجعت پسند عناصر کی نظروں میں قابل تعزیر تھے۔ اس آزمائش اور پر آشوب دور میں دراز قد، گٹھے ہوئے جسم، کشادہ سینے، مضبوط اور لمبے ہاتھوں والا ایک شخص ہر جگہ بھٹو صاحب کے ساتھ نظر آتا تھا۔ یہ امان اللہ خٹک تھا۔ جو اب پیپلز گارڈ کراچی کا سالار ہے۔

مسٹر بھٹو سے امان اللہ خان کے دیرینہ تعلقات ہیں ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم میں یہ ہمیشہ اور ہر جگہ سائے کی طرح بھٹو صاحب کے ساتھ رہے۔ ان کی کار یہی چلاتے تھے۔ سانگھڑ میں جب بھٹو صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا تو امان اللہ خان اس وقت بھی ان کے ساتھ تھے۔ امان اللہ خان نے سانگھڑ کے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ "اس دن مجھے ۱۰۴ ڈگری بخار تھا۔ جسم میں سخت درد تھا۔ پورا بدن بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔ بھٹو صاحب شہداد پور میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم ہمارے ساتھ نہ جاؤ یہاں پر آرام کرو۔ لیکن میں نہ مانا اور ان کے ساتھ جانے کے لئے اصرار کیا۔ میرے اصرار پر انہوں نے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ رہو گے تو تمہیں آرام کا موقع نہیں ملے گا۔ اس لئے معراج محمد خان کے ساتھ سانگھڑ چلے جاؤ۔ جلسے کا انتظام ہو گیا ہو گا۔ ہماری آمد تک جلسہ گاہ میں ایک دو گھنٹے آرام کر لینا۔

معراج محمد خان کے ساتھ جب امان اللہ خاں سانگھڑ گئے تو شہر سے باہر حروں کے ایک بہت بڑے گروہ نے انہیں روک لیا۔ یہ گروہ بندوقوں، لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے لیس تھا۔ پولیس کی بھاری تعداد بھی موجود تھی۔ اس گروہ نے امان اللہ کی کار روک لی۔ اور پوچھا "کہاں جا رہے ہو۔" معراج نے جواب دیا کہ "ہم شہر میں اپنے ایک دوست سے

الفتح کراچی



امان اللہ خاں خٹک گورنر سندھ ممتاز بھٹو کے ساتھ



امان اللہ خاں خٹک معراج محمد خان کے ساتھ

ملنے جا رہے ہیں۔" بڑی مشکل سے شہر میں داخل ہونے کی اجازت لی۔ شہر میں خوف و ہراس تھا۔ لوگ سہمے اور ڈرے ہوئے تھے۔ جلسہ گاہ میں پہنچ کر معراج نے امان اللہ سے کہا کہ بھٹو صاحب کو یہاں کی صورت حال سے باخبر کرنا انتہائی ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ وہ یہاں کا پروگرام منسوخ کر دیں۔ چنانچہ بخار کی شدت اور بیماری کی پرواہ کئے بغیر امان اللہ شہداد پور کے لئے روانہ ہوئے۔ بھٹو صاحب کا جلوس شہداد پور سے روانہ ہو چکا تھا۔ سانگھڑ سے پندرہ میل کے فاصلے پر امان اللہ کو بھٹو صاحب کا جلوس ملا۔ پہلی ہی کار میں بھٹو صاحب بیٹھے ہوئے تھے! امان اللہ کی کار کو دیکھتے ہی بھٹو صاحب اپنی کار سے اترے۔ امان اللہ نے انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور سانگھڑ نہ جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن بھٹو صاحب نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ "تم میری کار کے آگے چلو" چنانچہ سانگھڑ کی جانب رواں دواں اس جلوس کی پہلی کار امان اللہ خان کی تھی۔ سانگھڑ سے باہر ہی حروں نے اس کارواں کو روک لیا۔ بھٹو صاحب اپنی کار سے اتر کر حروں کے سامنے آ گئے اور کہا "ذوالفقار علی بھٹو میں ہوں" اگر گولی مارنی ہے۔ تو مجھے مارو لیکن اگر میرا ایک بھی آدمی زخمی ہوا تو اس کے سنگین نتائج کی ذمہ داری تم پر عائد ہو گی۔" بھٹو صاحب بمشکل اتنا کہہ پائے تھے کہ ایک گولی چلی جس سے بھٹو صاحب کی ٹوپی اڑ گئی۔ امان اللہ خان بھاگ کر بھٹو صاحب کے سامنے آ گئے۔ ڈھال بن گئے۔ مقصد یہ تھا کہ بے شک ان کی جان چلی جائے لیکن بھٹو صاحب بچ جائیں اسی اثنا میں پیپلز پارٹی کے دوسرے کارکنوں نے بھی انہیں گھیر لیا اور بھٹو صاحب کو بچانے کے لئے اغیار کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ دشمن نے ان پر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے بھرپور حملہ کیا۔ خود امان اللہ بھی زخمی ہوئے۔ لیکن انہوں نے بھٹو صاحب کو بچائے رکھا اور زبردستی گود میں اٹھا کر کار میں سوار کیا اور کار کو شہداد پور کی طرف دوڑا دیا۔ حالانکہ اس خطرناک لڑائی اور صورت حال کے باوجود سانگھڑ میں جلسہ کرنے پر اصرار کر رہے تھے۔

جب ۱۹۷۱ء کے اوائل میں مسٹر بھٹو نے اپنی پارٹی کے جیالے اور سرگرم کارکنوں کو تمغات دیئے۔ تو وہ امان اللہ خان کو بھی تمغہ دینا چاہتے تھے۔ امان اللہ خان سے پوچھا گیا کہ تم کیا لینا چاہتے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ "مجھے کسی تمغہ یا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کا اور پیپلز پارٹی کا ساتھ کسی ذاتی مفاد کے لئے نہیں دیا۔ آپ سامراج، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مخالف ہیں۔ استحصال کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں اور غریب عوام کی خوشحالی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اس لئے میں آپ کے ساتھ ہوں۔" جب بہت زور دیا گیا تو امان اللہ نے بندوق کی فرمائش کی کیونکہ انہیں ہتھیاروں کا بہت شوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت پستول رکھتے ہیں۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے انہیں تمغہ کی بجائے ۷۔ایم۔ایم کی بندوق دی۔

پیپلز گارڈ کی تنظیم اور کردار کے بارے میں امان اللہ خان

کراچی میں ۱۵۰۰ افراد پیپلز گارڈ میں شامل ہو چکے ہیں

نے بتایا کہ یہ تنظیم نومبر ۱۹۷۱ء میں قائم ہوئی۔ اگرچہ یہ تجویز بہت پرانی تھی۔ جنرل اکبر خان اس کے سربراہ ہیں جنہیں سیکرٹری آف پیپلز گارڈ کہتے ہیں۔ کراچی میں اس وقت تک تقریباً پندرہ سو افراد پیپلز گارڈ میں شامل ہو چکے ہیں۔ پیپلز گارڈ میں شمولیت کا طریقہ یہ ہے کہ ہر حلقہ کا پارٹی آفس اپنے علاقے کے جیالے، سرگرم اور صحت مند پارٹی کے کارکنوں کو پیپلز گارڈ میں شامل کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ یہ رپورٹ علاقے کے رکن صوبائی اسمبلی کو بھیجی جاتی ہے۔ وہ اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے اپنی رپورٹ شہر کے سالار کو دیتا ہے۔ سالار اپنے طور پر امیدواروں کے کردار سے آگاہی کرنے اور مطمئن ہونے کے بعد انہیں پیپلز گارڈ میں شامل کرتا ہے۔ ہر حلقہ میں پیپلز گارڈ کے سیکشن کمانڈر پلاٹون کمانڈر اور کمپنی کمانڈر مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ تمام کمانڈر ریٹائرڈ فوجی ہیں۔ ایک سیکشن میں ۱۰ سے ۲۵، ایک پلاٹون میں ۴۰ سے ۸۰ اور ہر کمپنی میں ۲۵۰ سے ۵۰۰ تک پیپلز گارڈ شامل ہوتے ہیں۔ پیپلز گارڈ کو اس وقت پریڈ اور ڈرل کی تربیت دی جا رہی ہیں۔ ابھی تک پارٹی نے بندوقیں مہیا نہیں کی ہیں۔ بندوقیں ملنے کے بعد باقاعدہ فوجی تربیت دی جائے گی۔ پیپلز گارڈ رضاکارانہ طور پر خدمات انجام دیتے ہیں۔ انہیں کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا۔

امان اللہ خان نے بتایا کہ پیپلز پارٹی کا بنیادی فرض ملک کا دفاع کرنا ہے۔ خواہ وہ بیرونی جارحیت ہو یا اندرونی عوام دشمن سازش، اس کے علاوہ سرمایہ داروں اور نوکر شاہی پر کڑی نظر رکھنا، عوامی استحصال اور رشوت خوری کو ختم کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل ہے۔ اپنے تنظیمی ڈھانچے اور فرائض کے اعتبار سے پیپلز گارڈ، مسلم نیشنل گارڈ اور "البدر" سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ ان تنظیموں کا کام استحصالی طبقوں کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا جب کہ پیپلز گارڈ خوشحال معاشرہ کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔

آخر میں امان اللہ خان نے پیپلز گارڈ کو ہدایت کی کہ رجعت پسند عناصر نمائندہ حکومت کے خلاف سازشوں میں، مصروف ہیں۔ اس لئے ان پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے پیپلز گارڈ کا فرض ہے کہ وہ ان سازشوں کو بے نقاب کریں۔ اور مظلوم کا ساتھ دیں۔

قومی ملکیت کا مسئلہ

مزدوروں، اور ماہرین پر مشتمل کنٹرول کمیٹیاں بنائی جائیں

صنعتوں پر

نوکر شاہی کے بجائے مزدوروں کا کنٹرول ہونا چاہیئے

شوکت صدیقی

حکومت نے مزید بارہ کارخانے اپنی تحویل میں لے لئے۔ اس طرح اب تک اہم صنعتوں کے بتیس ادارے حکومت کی تحویل میں آچکے ہیں۔ یہ اقدام پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنے منشور کے اس اقتصادی پروگرام کے تحت کیا ہے جس میں بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کا اعلان کیا گیا ہے اس اقدام سے آئندہ کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اِسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ جان لیا جائے کہ صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے سے کیا مراد ہے۔

صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی محنت کا استحصال بند کیا جائے۔ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ختم کی جائے۔ پیداواری قوت کی نشوونما کی جائے۔ پیداوار کے سرمایہ دارانہ رشتوں کو ختم کر کے ایسے پیداواری رشتے قائم کئے جائیں۔ جن کی بنیاد محنت کے استحصال کی بجائے باہمی تعاون پر ہو۔ پیداوار کا بنیادی مقصد منافع خوری کے بجائے معاشرے کی بنیادی ضروریات پوری کرنا ہو۔ پیداوار کو اس کے بنیادی مفہوم میں سماجی پیداوار بنایا جائے۔

اس مقصد کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھ لینا مناسب ہو گا کہ پیداوار کا بنیادی مفہوم کیا ہے؟ پیداواری قوت کیا ہوتی ہے؟ پیداواری رشتے کیا ہوتے ہیں؟ پیداوار اس وقت تک صرف پیداوار ہے جب تک وہ نجی مقصد کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص جو کپڑا بننا جانتا ہے اور صرف اپنی تن پوشی کے لئے کپڑا تیار کرتا ہے تو یہ صرف پیداوار ہے۔ لیکن جب وہ کسی کارخانے میں دوسرے محنت کشوں کے ساتھ کپڑا تیار کرتا ہے تو یہ پیداوار تجارتی مال commodity بن جاتی ہے۔ سماجی پیداوار بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ پیداوار سے فروخت تک اور فروخت سے اس کے عام استعمال تک اس کا تمام عمل کسی نہ کسی طور معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔

یہیں سے پیداواری قوت اور پیداواری رشتے جنم لیتے ہیں۔

پیداواری قوت سے مراد ہے پیداواری آلات اور وہ لوگ جو ان آلات کی مدد اور اپنی محنت، صلاحیت اور ہنر مندی سے پیداوار کرتے ہیں۔ یہ تمام عناصر مل کر معاشرے میں پیداواری قوت کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن یہ پیداواری قوت طرز پیداوار کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو طرز پیداوار کا وہ پہلو ہے۔ جس میں پیداواری عمل کے دوران لوگوں کا ایک دوسرے سے ایک تعلق، ایک رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی آپس کے رشتے پیداواری رشتے کہلاتے ہیں۔ قوت پیداوار کے ان ہی پیداواری رشتوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف سیاسی اور اقتصادی تقاضوں یا معاشروں کو جنم دیا اور وہ یہ ہیں۔ غلام رکھنے والا نظام، جاگیرداری نظام، سرمایہ داری نظام اور سوشلسٹ نظام۔ اسلامی نظام، عیسائی نظام، یہودی نظام یا ہندو نظام قسم کے کسی نظام کا تاریخ کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ اور نہ کوئی ان کا سائنٹیفک جواز ہے۔ غلام رکھنے والے آقا یا جاگیردار یا سرمایہ دار مسلمان بھی ہو سکتے ہیں۔ یہودی بھی ہو سکتے ہیں۔ عیسائی بھی ہو سکتے ہیں اور ہندو بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی مملکت پر ان کا اقتدار یا حکمرانی ان کے مذہبی عقائد سے نہیں ان کے طبقاتی کردار سے پہچانی جاتی ہے۔ اس اقتصادی نظام سے پہچانی جاتی ہے جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔

یہ پیداواری رشتے ہی ہیں جو مختلف نظاموں اور معاشروں کو جنم دیتے ہیں۔ اس لئے کہ معاشرہ کبھی ایک حالت میں نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی ایک دائرے میں نہیں ہوتی بلکہ یہ معاشرے کو نیچے سے اوپر لے جاتی ہے۔ یہ تبدیلی ایک ارتقائی عمل ہے، انقلابی عمل ہے۔ اور یہ تبدیلی اس وقت ہوتی ہے جب پیداواری رشتے تبدیل ہوتے ہیں۔ پیداواری رشتے کب تبدیل ہوتے ہیں؟ جب مادی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جب نت نئی سائنسی دریافتیں ہوتی ہیں۔ جب آلات پیداوار تبدیل ہوتے ہیں۔ پتھروں کے آلات سے دھات کے آلات تک، دھات کے آلات سے مشینوں تک، اور دو مشینوں سے الیکٹرونک تک۔ آلات پیداوار کی تمام تبدیلیاں، پیداواری رشتوں کی تبدیلیاں ہیں۔ جن کے نتیجے میں معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جنہوں نے اقتصادی سیاسی اور ثقافتی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ نئے افکار اور نظریات کو جنم دیا۔ نئے نظاموں کو جنم دیا۔ نئے معاشروں کو جنم دیا۔ معاشرتی تبدیلیوں کا یہی عمل بنیادی طور پر انسانی تاریخ ہے۔

ان پیداواری رشتوں کی کیا نوعیت ہوتی ہے؟ جاگیردارانہ نظام میں ان کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی صورت وہ رشتہ ہے جو طریق پیداوار کے دوران کسان اور کسان کے درمیان ہوتا ہے اور دوسری صورت وہ رشتہ ہے جو کسانوں اور جاگیرداروں کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں طریق پیداوار کے دوران ایک رشتہ وہ ہوتا ہے جو مزدور اور مزدور کے درمیان ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ رشتہ جو کسانوں اور کسانوں کے درمیان اور مزدوروں اور مزدوروں کے درمیان ہوتا ہے۔ باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا رشتہ ہوتا ہے اور وہ رشتہ جو کسانوں اور جاگیرداروں، اور مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان ہوتا ہے۔ باہمی تعاون کے بجائے دو متحارب قوتوں، دو مخالف طبقوں کے درمیان ہوتا ہے یعنی محنت کا استحصال کرنے والے اور استحصال کا شکار ہونے والے کا رشتہ۔

بات جب پھیل کر یہاں پہنچی ہے تو مناسب ہو گا کہ اس بات کی بھی وضاحت کر دی جائے کہ محنت کے استحصال سے کیا مراد ہے۔ سچ پوچھئے تو سارے مسئلہ کی جڑ قدر فاضل (Surplus value) ہے۔ قدر فاضل کا مطلب ہے۔ سماجی پیداوار میں محنت کا وہ حصہ جس کی اجرت محنت کش کو ملتی نہیں۔ یہ وہ منافع ہے جو جاگیردار اور سرمایہ دار پیداوار سے حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ پیداوار اجتماعی محنت

سوشلسٹ قومی ملکیت کا مقصد۔ ذرائع پیداوار پر محنت کشوں کا قبضہ

سے ہوتی ہے لہٰذا اس کا تمام فائدہ ان لوگوں کو اجتماعی طور پر پہنچنا چاہیئے جو اسے پیدا کرتے ہیں اور اس سے تمام معاشرے کو فائدہ پہنچنا چاہیئے اس لئے کہ ایسی پیداوار بنیادی طور پر سماجی پیداوار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دار ایک طرف تو محنت کشوں کو کم سے کم اجرت دیتے ہیں اور دوسری طرف گراں قیمتوں، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور ایسی ہی دوسری بدعنوانیوں سے معاشرے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس طرح پیداوار کا سماجی مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ مزدور پر دوہرا بار پڑتا ہے۔ وہ کم اجرت پاتا ہے اور ضروریات زندگی کی مہنگی قیمت ادا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں پیداوار منظم ہونے کے بجائے انتشار اور ابتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ پیداواری رشتوں میں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کے بجائے طبقاتی کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس صورت احوال کو صرف اسی صورت ختم کیا جا سکتا ہے کہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ختم کر دی جائے۔ جب نجی ملکیت ختم ہو جائے گی تو پیداواری رشتوں کی بنیاد باہمی تعاون پر ہو گی۔ پیداواری قوت منظم ہو گی پیداوار میں اضافہ ہو گا۔ مزدور زیادہ سے زیادہ محنت کر کے زیادہ فائدہ حاصل کریں گے۔ منافع خوری پیداوار کا مقصد نہ رہے گا تو قیمتیں بھی زیادہ نہ ہوں گی۔ معاشرے کو فائدہ پہنچے گا۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دینے کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن ہر جگہ کا انحصار حالات، مقام اور وقت پر ہے لہٰذا صنعتوں کو قومیانے کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انہیں دو بنیادی زمروں میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہیں۔

۱:۔ سوشلسٹ قومی ملکیت۔

۲:۔ بورژوا اور رجعت پسند قومی ملکیت۔

سوشلسٹ قومی ملکیت

سوشلسٹ قومی ملکیت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ختم کی جائے اور پرولتاریہ یعنی محنت کشوں کا ان پر قبضہ ہو۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اقتدار مملکت مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ہو۔ نہ صرف حکومت ان کے نمائندوں کی ہو بلکہ ان کے پاس ایسے پارٹی کارڈ موجود ہوں جو حکومت کے ہر شعبے کو اپنی نگرانی میں چلا سکیں۔ ان میں انقلابی تبدیلیاں لائیں اور ایسے سوشلسٹ معاشرے کی تعمیر کریں جو استحصال سے پاک وصاف ہو۔

سوشلسٹ بنیادوں پر ذرائع پیداوار کو قومیانے کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے مرحلے میں ٹرانسپورٹ، کانوں، بینکوں، انشورنس کمپنیوں اور اہم بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دیا جاتا ہے۔ جن صنعتوں کو حکومت کی تحویل میں لیا جاتا ہے ان پر نوکر شاہی کے افسروں کے بجائے محنت کشوں کا کنٹرول ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایسی کنٹرول کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں جو قومی ملکیت قرار دیئے جانے والے صنعتی ادارے یا کارخانے کے مزدوروں یا ان کی ٹریڈ یونین کے منتخب ارکان اور انجینئروں اور دوسرے عملے کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ اس میں حکومت کا بھی ایک نمائندہ شامل ہوتا ہے۔ مگر اس کے اختیارات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہوتا کہ وہ کنٹرول کمیٹی کے فیصلوں کو مسترد کر سکے وہ حکومت اور کمیٹی کے درمیان رابطہ قائم رکھتا ہے۔ کمیٹی کے جلسوں کی صدارت کرتا ہے۔ ان کی تجاویز اور سفارشات کو حکومت تک پہنچاتا ہے۔

چونکہ مزدوروں کو ابتدائی مرحلے میں انتظامی امور کا تجربہ نہیں ہوتا لہٰذا وہ کمیٹی کی سرگرمیوں کے دوران تربیت بھی حاصل کرتے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تربیت کے لئے ہر بڑے صنعتی مرکز میں ایسے ادارے قائم کئے جاتے ہیں جہاں مختصر مدت کے کورسوں کے ذریعے انہیں اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے کارخانوں کے انتظامی

سرمایہ داری کے خاتمہ کے لئے اجارہ داریاں ختم کرنا ضروری ہے

امور کی دیکھ بھال کر سکیں، انہیں خوش اسلوبی کے ساتھ چلا سکیں۔ پیداوار اور اس کی تقسیم کی نگہداشت کر سکیں۔ بدعنوانیوں کی روک تھام کر سکیں۔ مزدوروں کی سیاسی تربیت کر سکیں ان میں یہ شعور پیدا کر سکیں کہ پیداوار کا معیار بہتر ہو اور اس میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو۔

پیداوار میں اضافہ سوشلسٹ معیشت کی بنیادی شرط ہے۔ اس جدوجہد میں محنت کشوں کو اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کرنا ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کے مقابلے میں وہ اعلیٰ طریق پیداوار کو جنم دیتے ہیں۔ معاشرتی ارتقاء کا قانون بھی یہی بتاتا ہے۔ سرمایہ داری نے جاگیرداری کو اس لئے شکست دی کہ وہ جاگیرداری کے مقابلے میں محنت کی اعلیٰ پیداوار کی ضمانت دیتی ہے۔ اسی طرح سوشلزم سرمایہ داری کے مقابلے میں محنت کی اعلیٰ ترین پیداوار کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ سوشلسٹ نظام کو سرمایہ داری اور جاگیرداری پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ ان دونوں نظاموں کے مقابلے میں اعلیٰ معیار پیداوار کو جنم دیتی ہے۔ پیداوار میں زبردست اضافہ کرتی ہے۔ محنت کے استحصال کو ختم کرتی ہے۔ محنت کشوں کے لئے خوش حالی لاتی ہے اور پورے معاشرے کو خوشحال اور صحت مند بناتی ہے۔

یہ سمجھنا یقیناً درست نہیں کہ تمام ذرائع پیداوار کو بیک وقت قومی ملکیت قرار دے دیا جائے۔ یہ عمل بتدریج ہوتا ہے۔ معاشرتی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلی کا عمل یعنی سرمایہ داری سے سوشلزم تک کا سفر ایک ہی زقند میں طے نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے ایک عبوری دور درکار ہوتا ہے۔ جس میں سوشلزم اور سرمایہ داری دونوں برقرار رہتے ہیں۔ اس عبوری دور کی معیشت، ملی جلی یا مخلوط معیشت (MIXED ECONOMY) کہلاتی ہے۔ مخلوط معیشت کے بارے میں بعض حلقوں میں شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں جو درست نہیں لینن نے انقلاب روس کے بعد سوویت یونین کی نئی اقتصادی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے مضمون "پرولتاری آمریت کے دور میں معیشت اور سیاست" میں مخلوط معیشت پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

"نظریاتی طور پر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان یقینی طور پر ایک عبوری دور ہوتا ہے۔ جس میں ان دونوں معاشرتی معیشتوں کی شکلوں کی خصوصیات مشترک ہونی چاہئیں۔ یہ عبوری دور مرتی ہوئی سرمایہ داری اور ابھرتی ہوئی سوشلزم کے درمیان ایک جدوجہد کا دور رہنا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر یہ ایسا دور ہوتا ہے جس میں سرمایہ داری شکست خوردہ ہوتی ہے مگر پوری طرح ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف سوشلزم ایک قوت کی حیثیت سے ابھرتی ہے گو ابھی کمزور ہوتی ہے۔"

سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان کے عبوری دور کے بارے میں لینن نے جو وضاحت کی ہے اس کا واضح طور پر مفہوم یہ ہے کہ عبوری دور کی مخلوط معیشت عارضی ہوتی ہے وہ مستقل نہیں ہوتی۔ اس دور میں سوشلسٹ نظام طاقت ور ہوتا جاتا ہے اور سرمایہ داری نظام کمزور ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ختم ہو

صنعتوں کو نوکر شاہی کے سپرد کرنا، سوشلزم نہیں، نوکر شاہی سرمایہ داری ہے

جاتا ہے۔ یہ سوشلزم اور سرمایہ داری کے درمیان شدید جدوجہد کا دور ہوتا ہے۔ سرمایہ دار مختلف ہتھکنڈوں سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ سوشلسٹ معیشت کو ناکام بنا دیں۔ محنت کش اس کے برعکس جدوجہد کرتے ہیں کہ جن صنعتی اداروں یا کارخانوں پر ان کا کنٹرول ہو۔ اس کا انتظام خوش اسلوبی سے چلے۔ پیداوار زیادہ ہو اور معیاری ہو۔ قیمتوں میں کمی ہو اور محنت کشوں کے حالات بہتر ہوں۔ ان کو زندگی کی تمام بنیادی سہولتیں حاصل ہوں۔

اِس مرحلے پر حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ داروں کے ہتھکنڈوں سے باخبر رہے۔ ان کا سختی سے احتساب کرے اگر وہ خلوصِ دل سے تعاون کریں تو ان کا تعاون بھی حاصل کرے۔ ابتدائی مرحلے میں ان کے تجربے سے فائدہ اٹھائے ایسا کنٹرول کمیشن قائم کرے جس میں مزدوروں کے نمائندوں کے ساتھ دوسرے ماہرین بھی شامل ہوں جو تمام ذرائع پیداوار کی نگہداشت کرے، مزدوروں کی کمیٹیاں بنائے جو ایسے صنعتی اداروں کے حسابات اور کارکردگی کی وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کرتی رہیں جو ہنوز سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں موجود ہوں۔ سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لئے فوری طور پر اجارہ داریاں ختم کی جائیں۔ صرف ایسی صنعتیں سرمایہ داروں کے پاس رہنے دی جائیں جو بنیادی صنعتیں نہ ہوں۔ لیکن ان میں منافع کی شرح مقرر کرنے، قیمتوں کا تعین کرنے، پیداوار کا معیار بلند کرنے اور مزدوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے کا طریق کار براہِ راست حکومت کی ذمہ داری ہو یا کنٹرول کمیشن کے تحت ہو۔ غرضیکہ بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ذرائع پیداوار پر سے بتدریج نجی ملکیت ختم ہوتی جائے اور وہ مزدوروں کے کنٹرول میں قومی ملکیت بن جائیں، یورپ اور ایشیا کے سوشلسٹ ممالک میں صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کا یہی طریق کار رہا ہے۔

بورژوا اور رجعت پسند قومی ملکیت

بورژوا قومی ملکیت کی واضح مثال برطانوی طرزِ قومی ملکیت ہے۔ جہاں چند بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار کو قومیانے کا عمل لیبر پارٹی کے ہاتھوں ہوا۔ روس کے انقلاب کے ردِ عمل میں جب یورپ اور برطانیہ کے سوشل ڈیماکریٹوں نے محنت کشوں کو تاریخ کی ایک ابھرتی ہوئی قوت کی حیثیت سے محسوس کیا۔ تو انہوں نے اس خطرے کے پیش نظر کہ اقتدار مملکت محنت کشوں کے قبضہ میں نہ چلا جائے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دینے پر پوری توجہ صرف کرنی شروع کر دی، انہوں نے محنت کشوں کے سیاسی اقتدار کے بجائے صرف صنعتوں کو قومیانے کا نعرہ بلند کیا۔ سوشلزم کی توجیہہ انہوں نے اسی طرح کی۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں برطانوی لیبر پارٹی نے اپنے دستور میں صنعتوں کو قومیانے کی دفعہ شامل کی۔

۱۹۴۵ء میں برطانوی لیبر پارٹی نے اپنی انتخابی مہم میں اپنے ووٹروں سے یہ وعدہ کیا کہ وہ بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دے گی اور اس طرح ملک میں "جمہوری سوشلزم" لائے گی۔ اس پارلیمانی انتخاب میں لیبر پارٹی سوشلزم کے نعرے کی بنیاد پر بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد اس نے بنک آف انگلینڈ، کوئلے، بجلی، گیس کی صنعتوں، مواصلات، اٹرانسپورٹ، ریلوے، دریائی اور کسی حد تک شاہراہوں کے ذرائع نقل و حمل، شہری فضائی سروس اور فولاد کی صنعت کے ایک حصّہ کو قومی ملکیت قرار دیا۔ جن صنعتوں کو قومیایا گیا وہ برطانیہ کی مجموعی صنعت کا ۲۰ فی صد تھی۔ لیکن جن صنعتوں کو حکومت کی تحویل میں لیا گیا ان سے بنیادی طور پر محنت کشوں کی بجائے سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچا۔ کوئلے، بجلی، گیس اور خام مال پیدا کرنے والی صنعتیں اور مواصلات اور ٹرانسپورٹ جب حکومت کی تحویل میں آئیں تو ان کی قیمتیں کم ہوئیں۔ کرایہ کم ہوا۔ چنانچہ پیداوار پر سرمایہ داروں کو لاگت میں بھی اسی اعتبار سے کمی ہوئی۔ لیکن سستی بجلی اور سستا کوئلہ اور

مزدور، کسان اور

ترقی پسند دانش ور اپنے اتحاد

کو مضبوط اور جدوجہد

کو جاری رکھیں

سستی ٹرانسپورٹ حاصل کرنے کے باوجود انہوں نے قیمتیں من مانی مقرر کیں اور اپنے منافع کی شرح میں اضافہ کر دیا۔ اس لئے کہ حکومت کا ان پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ اسی طرح بنک آف انگلینڈ حکومت کی تحویل میں جانے کے بعد قطعی متاثر نہ ہوا۔ اس کے سترہ ہزار حصص بدستور حصہ داروں کے قبضے میں رہے۔ ان کو اپنے حصوں پر اسی طرح ۱۲ فی صد کے حساب سے منافع ملتا رہا۔

اس کے علاوہ برطانوی لیبر پارٹی نے جن صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دیا تھا۔ وہ دوسری عالمی جنگ میں بڑی حد تک تباہ ہو چکی تھیں۔ شدید بحران کا شکار تھیں، سرمایہ داروں کے لئے ان کو چلانا سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ لیبر پارٹی کی حکومت نے انہیں حکومت کے سرمائے سے از سرِ نو تعمیر کیا۔ منظم کیا اور سرمایہ داروں کو اتنا کثیر معاوضہ ادا کیا جو ان کی اصل قیمت سے دوگنا تھا۔ اس کثیر معاوضے سے سرمایہ داروں نے نئی صنعتیں قائم کیں۔ چنانچہ اس طرح نہ صرف سرمایہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ اجارہ داریوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ لطف یہ کہ آئندہ انتخابات میں جب کنزرویٹو پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو انہوں نے بیشتر صنعتوں کی قومی ملکیت ختم کر دی اور انہیں سابقہ مالکان کے حوالے کر دیا۔

صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کی کارروائی اسی طرح فرانس، جرمنی اور آسٹریا میں ہوئی۔ دراصل یہ تمام کارروائی ان ممالک میں محنت کشوں کی بڑھتی ہوئی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ اس کا مقصد بنیادی طور پر اجارہ دار سرمایہ داری کی اقتصادی اور سیاسی قوت کو مستحکم بنانا اور محنت کشوں کو ان کے نصب العین سے گمراہ کرنا تھا۔ برطانیہ اور یورپ کے ان ممالک میں صنعتوں کو اس طرح قومی ملکیت قرار دیا گیا کہ اس سے نہ صرف سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچا، بلکہ ان پر کنٹرول بھی ان کا ہی رہا۔ ایسی صنعتوں کو مزدوروں کے کنٹرول میں دینے کے بجائے ان پر نوکر شاہی کے افسروں کو مقرر کیا گیا جو اپنے طبقاتی کردار کے اعتبار سے محنت کشوں کے مخالف اور سرمایہ داروں کے حامی ہوتے ہیں۔ نوکر شاہی کے افسروں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور بدعنوانی سے حاصل کیا جانے والا سرمایہ صنعتوں میں لگا کر خود کسی مرحلے پر سرمایہ دار بن جائیں۔ صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کا یہ طریق کار بنیادی طور پر نوکر شاہی سرمایہ داری ہوتی ہے۔

سوشلسٹ ممالک سے قطع نظر، سرمایہ دار ممالک میں صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے سے جہاں محنت کشوں کی جدوجہد کو عارضی طور پر نقصان پہنچا ہے۔ وہاں اس سے کچھ فائدہ بھی ہوا ہے اور وہ ہے اس کا جمہوری کردار۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ جن ممالک میں سرمایہ داری کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اور وہ ترقی کر کے سامراج کے مرحلے پر پہنچ چکی ہے وہاں محنت کشوں اور جمہوری قوتوں کو صنعتوں کو قومیانے کے عمل سے خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا۔ بجز اس کے کہ ان کی اجرتوں میں کسی قدر اضافہ ہو گیا۔ ان کو ضروریاتِ زندگی کی کچھ سہولتیں حاصل ہو گئیں۔ لیکن ان معاشی سہولتوں کے نتیجے میں طبقاتی

جدوجہد شدید ہونے کے بجائے کسی قدر کمزور پڑ گئی۔ اس لئے کہ محنت کشوں کا نصب العین چند اقتصادی مراعات حاصل کرنا نہیں بلکہ اقتدارِ مملکت حاصل کرنا ہے تاکہ وہ ذرائع پیداوار پر سے نجی ملکیت ختم کر کے خود ان کے مالک بن جائیں لیکن وہ ممالک جہاں سرمایہ داری کمزور ہے۔ وہاں صنعتوں کے قومی ملکیت قرار پانے سے مزدور تاریخ کے ایک اہم طبقے کی حیثیت سے ابھر رہے ہیں۔ ان کے سیاسی شعور میں پختگی پیدا ہو رہی ہے۔ ان میں یہ اعتماد پیدا ہو رہا ہے کہ انہیں معاشرے میں سب سے اہم کردار ادا کرنا ہے جب تک مملکت پر ان کی حکمرانی نہ ہو گی۔ جب تک ذرائع پیداوار پر ان کا کنٹرول نہ ہو گا۔ اُس وقت تک محنت کا استحصال ختم نہ ہو گا۔ اقتصادی عدمِ توازن ختم نہ ہو گا۔

جاگیرداروں اور سرمایہ داروں اور استحصال کرنے والے طبقوں کی بالادستی ختم نہ ہو گی۔ معاشرتی برائیاں ختم نہ ہوں گی۔ بدعنوانیاں ختم نہ ہوں گی۔ صحت مند معاشرہ پیدا نہ ہو گا۔

لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر چیز کا انحصار حالات، وقت اور مقام پر ہے۔ یہی بات پاکستان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ حالات میں عوام کی کثیر اکثریت، یعنی مزدور اور کسانوں کا سیاسی شعور کس مرحلے پر ہے۔ ان کی جدوجہد کی رفتار کیا ہے۔ سیاسی اور اقتصادی حالات کیا ہیں۔ ان کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ اگر ان کا سائنٹیفک تجزیہ نہ کیا جائے گا تو جمہوری قوتیں دائیں بازو کی موقع پرستی یا بائیں بازو کی انتہا پسندی اور مہم جوئی کا شکار ہو سکتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جمہوری مرکزیت پر زور دیا جائے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت نے اہم صنعتوں کو حکومت کی تحویل میں لے کر جو اقدام کیا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک اہم اقدام ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مینجنگ ایجنسیوں کو ختم کر کے اُس نے اجارہ دار سرمایہ داری پر موثر ضرب لگائی ہے۔ پاکستان کی سیاسی زندگی میں ایک نیا موڑ ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں۔ جن صنعتوں کو قومیایا گیا ہے۔ اگر وہ نوکر شاہی کے کارندوں کے سپرد کر دی گئیں اور مزدوروں کو ان انتظام میں پوری طرح شریک نہ کیا گیا تو ان کا حشر بھی وہی ہو گا۔ جو اب تک پی آئی اے۔ نیشنل بنک، نیشنل شپنگ کارپوریشن اور اسی قبیل کی پبلک سیکٹر کی دوسری صنعتوں میں دیکھنے میں آیا ہے بدعنوانیاں ہوں گی۔ اقربا پروری ہو گی، رشوت ستانی ہو گی۔ اور مزدوروں کو فائدہ پہنچنے کے بجائے چند افسروں اور ان کے خاندانوں اور ان کے توسط سے سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ سوشلزم نہ ہو گا بلکہ نوکر شاہی سرمایہ داری ہو گی

اِس کے علاوہ اگر پاکستان میں تمام بنیادی صنعتوں اور تمام بنیادی ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار نہ دیا گیا۔ صرف چند صنعتوں پر اکتفا کیا گیا۔ اور جن صنعتوں کو قومیایا گیا ہے ان میں سرمایہ داروں کے حصے ختم نہ کئے گئے۔ تو اس کے نتیجے میں سرمایہ داری کمزور ہونے کے بجائے قوت حاصل کر لی جائے گی۔ سوشلسٹ معاشرے کی تعمیر کا خواب محض خواب بن کر رہ جائے گا۔ پیپلز پارٹی چونکہ محنت کشوں کی جماعت نہیں ہے بلکہ مختلف جمہوریت پسند قوتوں کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ لہذا اس میں طبقاتی تضادات بھی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محنت کش طبقہ کسانوں اور ترقی پسند دانش وروں کے اتحاد سے اپنی قوت کو مستحکم بنانے، خود کو منظم کرنے اور سوشلزم کی تعمیر کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھے۔

زندگی اے زندگی

پی سی ایس آئی آر کے حکام اس کی ترقی کو اپنی ہتک سمجھ بیٹھے

یہ ایک اپیل ہے۔ پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کا سپرنٹنڈنٹ چوہدری محمد ابراہیم حلیم چشتی، صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو اور گورنر سندھ ممتاز بھٹو سے فریاد کناں ہے۔ اُس نے اپنی زندگی کے بہترین ایام پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ میں صرف کئے۔ جب اس کے بال چاندی کی رنگت اختیار کرنے لگے اور ریٹائرمنٹ میں ایک سال رہ گیا تو ۹ نومبر ۱۹۷۱ء کو اُس کے ہاتھوں میں جبری ریٹائرمنٹ کے احکامات تھما دیے گئے۔ اس نے ان احکامات کو وصول کرنے سے انکار کر دیا اور سندھ لیبر کورٹ میں دعویٰ دائر کیا۔ جس پر فاضل عدالت نے کونسل کو حکم امتناعی جاری کیا کہ وہ مقدمے کا فیصلہ ہونے تک چوہدری محمد ابراہیم حلیم چشتی کو برطرف، برخاست یا اُس کے خلاف کوئی اور کارروائی نہ کرے لیکن پی سی ایس آئی آر کے حکام نے آج تک اُسے ڈیوٹی پر نہیں لیا۔ اب حلیم چشتی دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ اس کے بچوں کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ نوبت فاقہ کشی تک آ گئی ہے

چوہدری محمد ابراہیم حلیم چشتی ۲۱ نومبر ۱۹۵۶ء سے کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ میں کنفرمڈ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس دوران اس کی کارکردگی عمدہ رہی۔ سروس ریکارڈ بے داغ رہا۔ لیکن اُس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب یکم ستمبر ۱۹۶۱ء کو اُس سے بہت جونیئر شخص اسماعیل خان کو سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ترقی دے دی گئی جو ۱۸ نومبر ۱۹۶۳ء سے کنفرمڈ اسسٹنٹ تھا۔ حلیم چشتی ۲۱ نومبر ۱۹۵۶ء سے کنفرمڈ اسسٹنٹ ہونے کے علاوہ ڈویژنل اکاؤنٹنٹ کا بھی امتحان پاس کئے ہوئے تھا۔ حلیم چشتی نے اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے حق کے لئے پی سی ایس آئی آر کے حکام سے کئی بار رجوع کیا۔ لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک وہ اپنا حق مانگتا رہا لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مجبوراً اس نے ۳۰ جون ۱۹۶۹ء کو مارشل لاء حکام سے رجوع کیا۔ کرنل عبدالغنی نے ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو پی سی ایس آئی آر کے حکام کو عدالت میں بلوایا اور حکم دیا کہ وہ چوہدری محمد ابراہیم حلیم چشتی کو سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ترقی دیں۔ چنانچہ ۸ اگست ۱۹۶۹ء کو اُسے سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا۔ لیکن پی سی ایس آئی آر کے ناخدا اُس سے ناراض ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک درجہ سوم کا ملازم جسے وہ اپنا زرخرید غلام سمجھتے تھے اپنا حق طلب کرے اور اس کی جسارت اتنی بڑھے کہ وہ مارشل لاء حکام سے حکم دلوائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس توہین کا بدلہ لینے کے لئے حلیم چشتی کا تقرر ایک تربیتی مرکز میں کر دیا۔ جہاں افسروں نے اُسے طرح طرح سے تنگ اور ہراس کیا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ حلیم چشتی پی سی ایس آئی آر امپلائز یونین کا جنرل سیکرٹری بھی ہے۔ چنانچہ حکام اُسے برطرف کرنے کا منصوبہ بناتے رہے۔ اور یہ موقع جلد ہی انہیں مل گیا۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح وقوع پذیر ہوا کہ روز روز کی انتقامی کارروائیوں سے تنگ آ کر حلیم چشتی نے تربیتی مرکز کے بعض افسروں کی تحریری شکایت چیئرمین کو کی۔ اس تحریری شکایت پر تحقیقات ہوئیں اور حلیم چشتی کو اظہارِ وجوہ کا نوٹس دیا گیا کہ افسروں پر لگائے گئے الزامات کی بنیاد پر کیوں نہ اسے ریٹائر کر دیا جائے۔

اسی عرصے میں چوہدری محمد ابراہیم حلیم چشتی بیمار ہونے کی وجہ سے ایک ماہ کی چھٹی پر چلے گئے۔ جب وہ ۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو صحت یابی کے بعد ڈیوٹی پر گئے تو یہ کہہ کر انہیں کام پر لینے سے انکار کر دیا گیا کہ تمہیں ۹ نومبر ۱۹۷۱ء سے جبراً ریٹائر کر دیا گیا ہے۔" جب سے وہ بحالی ملازمت کے لئے دربدر کے دھکے کھا رہا ہے۔ مقدمہ ابھی سندھ لیبر کورٹ میں چل رہا ہے۔

ہفتہ کے چار ہنگامے

بہاولپور

تین ہزار افراد صرف امیر آف بہاولپور کی خدمت کے لئے وقف ہیں

نمائندہ الفتح

پاکستان پیپلز پارٹی بہاول پور کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام ۱۴ جنوری ۱۹۷۲ء کو ہوا جس سے پیپلز پارٹی ضلع بہاولپور کے جنرل سیکرٹری موسیٰ سعید کے علاوہ ممتاز احمد فارانی ایڈووکیٹ حکیم فقیر محمد چشتی، بیگم بلقیس حبیب اللہ، مہر نور احمد نادر، ظفر ملک ایڈووکیٹ، ڈاکٹر محمد اسلم نادر، ارشاد متین، پرویز اختر اور محمد انور شاہ نے خطاب کیا۔ جناب جعفر ملک نے جلسے کی صدارت کی.

موسیٰ سعید نے سابق والیان ریاست کے گزارہ الاؤنس کی بحالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ریاستوں کے سابق حکمران غریب نہیں ہیں، ان کی لاکھوں روپے کی جائیداد ہے والیان ریاست نے صدر بھٹو کو قائد اعظم کے دستخط شدہ دستاویزات دکھائیں اور صدر بھٹو نے ان کے وظائف بحال کر دیئے، امیر آف بہاول پور نے صدر بھٹو کو بتایا کہ ان کے تین ہزار ملازم بیروزگار ہو گئے ہیں، موسیٰ سعید نے کہا کہ اگر امیر آف بہاول پور کے دل میں اپنے ملازمین کا اتنا ہی درد تھا تو اُسے صدر پاکستان سے کہنا چاہیئے تھا، کہ میرے وظیفہ کے ۱۶ لاکھ روپے آپ دیجئے اور ۱۶ لاکھ روپے میں اپنے پاس سے دیتا ہوں اور اس ۳۲ لاکھ روپے سے ان تین ہزار ملازمین کے لئے کوئی کارخانہ لگا دیجئے تاکہ وہ بیروزگاری سے محفوظ ہو جائیں، موسیٰ سعید نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تین ہزار افراد امیر آف بہاول پور کی خدمت کے لئے وقف رہیں اگر یہ افراد کارخانوں میں کام کرتے تو ملک کی پیداوار بڑھتی، مزدور اس ملک کی دولت ہیں۔ اگر محنت کش کا ایک دن بھی ضائع ہوتا ہے تو پوری قوم کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے ہم نے جنگ اس لئے ہاری کہ ہم نے افرادی قوت سے کام نہیں لیا۔ صدر بھٹو کو امیر آف بہاول پور کو یہ جواب دینا چاہیئے تھا کہ قائد اعظم کے زمانے میں ملک کی حالت کچھ اور تھی لیکن اب ملک کا خزانہ خالی ہو چکا ہے۔ اب قومی قومی معیشت والیان ریاست کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی.

ریلوے مزدور یونین کے صدر مہر نور احمد نادر نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عوامی مطالبات اور شکایات کے انبار لگے ہوئے ہیں انتظامیہ کا فرض ہے کہ وہ مسائل حل کرے، مہر نور احمد نادر نے کہا کہ آٹے کے نرخ ۲۶ سے ۲۸ روپے فی من تک پہنچ گئے ہیں ہماری غریب مائیں، بہنیں آٹا خریدنے کے لئے گھنٹوں قطاروں میں کھڑی رہتی ہیں، ماضی میں ہماری آوازیں چیختے چیختے تھک گئیں لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی ہم نے بہت برداشت کیا۔ لیکن اب یہ یحییٰ خان کی حکومت نہیں نمائندہ حکومت ہے، اس کے عہد میں جو ڈپٹی کمشنر عوام کو مقررہ نرخوں پر آٹا فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کی سختی سے باز پرس ہونی چاہیئے.

طالب علم رہنما ارشاد متین نے اپنی تقریر میں کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور ہمیں شکست ہو چکی ہے یہ شکست پاکستانی عوام کی نہیں سرمایہ داروں کو ہوئی ہے ہماری جد و جہد سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف ہے۔ عالمی سامراج دیکھے گا کہ ہم اس جنگ میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ ارشاد متین نے بی، وی ہسپتال کی انتظامیہ کی بدعنوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غریب مریضوں سے کہا جاتا ہے، دو سو روپے لاؤ تب آپریشن ہوگا۔ کیا ایسے افسروں کو ملازمت اس لئے دی گئی تھی کہ وہ عوام سے رشوت وصول کر کے بنگلے بنائیں، کاریں خریدیں اسی طرح بلدیہ اور ڈسٹرکٹ کونسل میں ٹھیکے کمیشن پر دیئے جاتے ہیں یہ سلسلہ اب بند ہونا چاہیئے.

لاہور

پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے مطالبات منظور کئے جائیں

نمائندہ الفتح

پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے مطالبے پر گورنر پنجاب نے لاہور کے پانچ روزناموں کوہستان، آزاد، نیشنل نیوز، ندائے ملت اور رجاوداں کے کارکنوں کے واجبات کی ادائیگی کے لئے لیفٹیننٹ کرنل چوہدری محمد حسین مبارک کو ثالث مقرر کیا ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں مارشل لا کا ضابطہ جاری کیا گیا ہے پنجاب یونین آف جرنلسٹس نے گورنر پنجاب کے اس اقدام کو سراہا ہے لیکن اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ روزنامہ نوائے وقت اور خبر رساں ایجنسی پاکستان پریس انٹرنیشنل کے کارکنوں کو نظر انداز کر دیا۔ اپریل ۱۹۷۰ء کی ملک گیر ہڑتال کے بعد روزنامہ نوائے وقت کے پچاس اور پی پی آئی کے دس کے قریب کارکنوں کو برطرف کر دیا گیا تھا۔ ان تمام کارکنوں کو ان کے واجبات ادا نہیں کئے گئے۔ اس کے علاوہ نوائے وقت کے کارکنوں کے پراویڈنٹ فنڈ انتظامیہ نے خورد برد کیا ہے برطرف کئے جانے والے کسی بھی کارکن کو پراویڈنٹ فنڈ ادا نہیں کیا گیا، پی یو جے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ روزنامہ نوائے وقت اور پاکستان پریس انٹرنیشنل کے کارکنوں کے واجبات کی ادائیگی کا فریضہ بھی گورنر پنجاب کے مقرر کردہ ثالث کے سپرد کر دیا جائے اور اس مقصد کے مارشل لا کے حکم میں ترمیم کی جائے۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس یہ مطالبہ کرنے میں بھی حق بجانب ہے کہ ثالث کو ان اخبارات کے واجبات وصول کرنے کے اختیارات بھی دیئے جائیں اس لئے کہ ان اخبارات کے لاکھوں روپے واجب الادا ہیں۔ ثالث کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ یہ واجبات مختلف اشتہاری اداروں اور دوسری فرموں سے وصول کریں۔

جھمپیر ہائی اسکول کا صدر معلّم

جماعت اسلامی کا "مردِ صالح" ہے

انور حسین بہرانی

نمائندہ حکومت قائم ہو چکی ہے لیکن سامراج نواز اور شکست خوردہ عناصر اپنی عوام دشمن سازشوں سے باز نہیں آئے، وہ اس حکومت کو ناکام بنانے کی مکروہ کوششیں کر رہے ہیں۔ جھمپیر کا ہائی اسکول رجعت پسندوں اور عوام دشمنوں کا گڑھ بن گیا ہے. اس کے ہیڈ ماسٹر شہاب الدین عباسی جماعت اسلامی کے "مردصالح" ہیں انہوں نے گٹھ جوڑ کر کے تمام عوام دوست اساتذہ کو برطرف کر دیا۔ اس وقت ۱۲ اساتذہ کی بجائے صرف ۲ استاد کام کر رہے ہیں اس کے علاوہ ہیڈ ماسٹر سندھی، مہاجر، ہندو اور مسلمان کا مسئلہ پیدا کر رہے، یہ رجعت پسندوں اور سامراجیوں کا پرانا حربہ ہے. موصوف نے یہ حربہ تھانہ بولا خان اور جاتی میں بھی استعمال کیا تھا۔ اس علاقے میں جب تعصب کی آگ نے زور پکڑا، تو ان کا تبادلہ جھمپیر کر دیا گیا۔ یہاں کے طلبا اور عوام نے متعدد بار گورنر سندھ اور ڈائریکٹر محکمہ تعلیم کو ہیڈ ماسٹر کے تبادلے کے لئے درخواستیں دیں تار بھی دیئے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

گذشتہ دنوں ہیڈ ماسٹر کے خلاف نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے احتجاجی جلوس نکالا۔ طلبا ہیڈ ماسٹر کا پتلا اٹھائے ہوئے تھے اور اس کے تبادلے کا مطالبہ کر رہے تھے، جلوس کے اختتام پر ہیڈ ماسٹر کا پتلا نذر آتش کر دیا گیا۔

داستان ایک دستکار کی

سات کھانے والے ایک کمانے والا

احتشام زرّین فاروقی

پاکستان کو قائم ہوتے چوبیس سال سے اوپر ہو گئے مگر اس عرصے میں یہاں کے عوام نے کیا کیا نہ دیکھا۔ اس ملک میں ہمیشہ سے سیاسی، معاشی اور اخلاقی بحران آتے رہے، سیاست، معیشت اور اخلاق ان تینوں کی تاریخ ایک دوسرے کے ساتھ چلتی ہے۔ اس لئے کہ ان تینوں کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہے اگر کسی ملک کے سیاسی حالات خراب ہوتے ہیں تو معیشت بھی تباہ ہو جاتی ہے اور جب ان دونوں کی شکلیں بگڑ جاتی ہیں تو اخلاق کا گر جانا بھی لازمی بات ہے اس کے بعد کسی قسم کا سکون باقی نہیں رہتا لوگوں میں ایک قسم کی بے چینی اور غیر یقینی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان ہر چیز سے خوف کھانے لگتا ہے اور یہی سوچتا رہتا ہے کہ اگلے لمحے نہ جانے کیا ہو جائے۔

ہمارے اس خیال کی تصدیق اس وقت ہوئی جب ہم نے شوکت نامی ایک دستکار سے بات کی، اس کے الفاظ ہیں۔
"جی یہاں تو الٹا سیدھا ہوتا رہا جو بھی آیا راوا کرتا رہا۔ آدمی تو مصیبت میں آ گیا ہے۔"

شوکت ۱۹۴۷ء کے آخر میں جالندھر سے یہاں آیا، وہ وہاں بھی لکڑی کا کام کرتا تھا اور یہاں بھی لکڑی کی میزیں، پھولدان اور دوسری آرائش ضرورت کی چیزیں بناتا ہے۔ وہ لکڑی پر نقش و نگار بناتا ہے انہیں اشیاء میں ڈھالتا ہے اور ساتھ ہی پلاسٹک کا کام بھی کرتا ہے اس کام کے لئے وہ ایک دوسرے آدمی سے مدد لیتا ہے اور اس کے بدلے اسے پیسے ادا کرتا ہے۔

گولی مار ختم ہوتے ہی دائیں طرف فردوس کالونی میں وہ ایک چھوٹے سے معمولی مکان میں رہتا ہے اور یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ اس کے مکان کا مالک اور اس ہی کے خاندان کے کچھ دوسرے لوگ اسی شہر میں پندرہ بیس مکانوں کے مالک ہیں۔

شوکت نے اپنے مکان کے آگے لکڑی کی ایک ٹوٹی پھوٹی آڑ کھڑی کر لی ہے اور اس چھوٹی سی جگہ کو اپنا کارخانہ سمجھ کر صبح سے شام تک لکڑی کی تراش خراش کرتا ہے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ چیزیں خوبصورت سے خوبصورت ہوں۔ یہ آدمی جو چیزیں بناتا ہے وہ دوکاندار خریدتا ہے۔ اس نے ہمیں ایک میز دکھائی جو ۳۵ روپے میں دوکاندار کے ہاتھ بکتی ہے اور اس قسم کی میز پر اس کی لاگت ۳۰ روپے آتی ہے اس طرح اسے صرف پانچ روپے کا فائدہ ہوتا ہے جبکہ دوکاندار مقامی خریداروں کے ہاتھ بڑی آسانی کے ساتھ ۴۵ روپے میں بیچ لیتا ہے اور باہر کے ملکوں کے لوگ اس ہی چیز کے ۶۰ روپے تک دیتے ہیں۔ اس طرح دوکاندار کو کم سے کم دس روپے کا اور زیادہ سے زیادہ ۲۵ روپے کا منافع ہوتا ہے۔ جبکہ اس کا کام صرف مال کو دوکان میں سجانا اور بیچنا ہوتا ہے دوسری طرف کاریگر اپنے ہاتھ سے محنت کرتا ہے۔ پھانسوں کی چبھن برداشت کرتا ہے اور اس کا صلہ صرف پانچ روپے، ملک کے اندر بکنے کے علاوہ یہ مال باہر بھی درآمد کیا جاتا ہے۔

آج کل مارکیٹ ڈاؤن ہے اس لئے شوکت کام نہیں کر رہا ہے وہ مال بنا کر کیا کرے جب طلب نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ لکڑی بھی مہنگی ہو گئی ہے، پہلے مشرقی پاکستان سے آتی تھی اب ملک کا یہ حصہ بھارت کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔ تو لکڑی کے دام بھی بڑھ گئے۔ پہلے لکڑی کی قیمت دس روپے فٹ تھی، اب ۲۴ روپے فٹ ہے۔ شوکت تو اب تھوڑا بہت مرمت کا کام کر لیتا ہے اگر کوئی دو کیلیں بھی ٹھکوانے آ جاتا ہے تو وہ اسے غنیمت سمجھتا ہے۔

حالیہ جنگ اور اس سے پیدا ہونے والے حالات نے نچلے درجے کے لوگوں کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ بڑے لوگوں کا کاروبار اگر دو مہینے بھی بند رہے تو کوئی بات نہیں ان کے پاس پھر بھی کھانے کو بہت ہوتا ہے۔ جب ہی تو یہ کہاوت مشہور ہے کہ ہاتھی مرے پھر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ جو روز کے روز پیسہ پیسہ جمع کر کے کھاتے ہیں ان کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ وہ تو غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہماری رائے ہے کہ نئی حکومت گھریلو صنعتوں پر بھی توجہ دے اور دستکاروں کی ہمت افزائی کرے۔ کیونکہ قلم پکڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مگر انہیں اوزار پکڑنا آتا ہے۔ یہ لوگ جو چیز بنا لیتے ہیں۔ اسے غیر ممالک والے بے حد پسند کرتے ہیں۔ حکومت اگر ان کو رہنے کی سہولتیں مہیا کرے اور ان کو کام کرنے کی جگہ دے، تو یہ زیادہ اچھے طریقے پر کام کر سکیں گے، اور اس مقصد کے لئے حکومت ایک ایسا ادارہ قائم کرے، جو ان کا مال غیر ممالک بھیجے۔ اس طرح ان غریبوں کی مدد بھی ہو گی اور حکومت کو زرمبادلہ بھی ملے گا۔

شوکت کے خاندان میں سات افراد ہیں۔ پانچ بچے ایک بیوی اور ایک خود، بڑے تین بچے اسکول جاتے ہیں۔ اور اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ کے، ایم سی والے اسکول میں مشکل سے داخلے دیتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ بچے کے نمبر کم ہیں۔ کبھی یہ کہ اسکول میں جگہ نہیں۔ اور ان اسکولوں کا جو معیار ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ جو پارٹی برسرِ اقتدار آئی ہے۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

"کہنے لگی ہاں جی لگتا تو ایسا ہے کہ اچھی ثابت ہو گی۔" ہم نے وضاحت چاہی کہ پہلے کیسا لگتا تھا؟ وہ بولی پہلے تو لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ پارٹی دین کو ختم کر دے گی اور پھر کبھی نہ کبھی کمونزم (کمیونزم) آ جائے گا۔" ہمیں اس پر بہت ہنسی آئی، ذرا غور کیجئے ہمارے عوام کتنے لاعلم ہیں شاید اس لئے کہ عوام کی بھاری اکثریت تعلیم سے محروم ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ پڑھے لکھے جاہلوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ یہ لوگ ان بھولے بھالے لوگوں کو اور بھی زیادہ لاعلم بنا دیتے ہیں۔

ہ فرحت یک نفسی غنیمت جان
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق



قارئین کہتے ہیں

بھٹو صاحب!

عوام کا پیٹ تقریروں سے نہ بھریئے

بھٹو صاحب نے اقتدار میں آنے سے اب تک عوام کے لئے بہت کچھ کیا۔ لیکن شاید یہ بات اُن کے علم میں نہ ہو کہ ان کی فی الفور اصلاحات سے عوام کے پسے ہُوتے طبقے، مزدوروں، کسانوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بھٹو صاحب اور اُن کی پارٹی کے دُوسرے رہنماؤں کی بار بار اپیلوں سے یہ تو ہُوا کہ بے چینیاں کسی حد تک دب گیئں۔ مگر ختم نہیں ہُوئی ہیں۔ سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے روزمرّہ کے مسائل سے پریشان ہیں۔ اُن کی بڑی تعداد بے روزگار ہے۔ نوکر شاہی سرمایہ داروں سے مِل کر اُن کے مسائل میں روز افزوں اضافہ کر رہی ہے۔ پیپلز پارٹی کے بعض رہنما اُن سے مل کر اپنے دام کھرے کرنے میں لگے ہُوتے ہیں۔ عوام پوچھ رہے ہیں کہ اگر اُن کے مسائل کا علاج پیپلز پارٹی کے پاس نہیں ہے تو پھر کس کے پاس ہے؟

عوام اب جذباتی نعروں، اور تقریروں سے بہلنے والے نہیں ہیں۔ وہ اپنے مسائل کا ٹھوس حل چاہتے ہیں۔ اس ملک سے سرمایہ داری، جاگیر داری اور نوکر شاہی کے ظالمانہ تسلط کا خاتمہ چاہتے ہیں۔

علیم الدین - ناظم الدین۔ کراچی

کیا آپ اس سازش سے پردہ اُٹھا سکتے ہیں؟

میں ایک مزدور ہوں، بے روزگار بھی ہوں، میرے بیوی بچے بھی ہیں۔ بھٹو حکومت کے انتظار میں تھا۔ ہمارے بھی دن پلٹیں گے۔ سکھ کے دن دیکھنے کا موقع ملے گا۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری یہ خواہش پوری نہ ہو گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے بھٹو اقتدار میں آیا ہے۔ سازشیں زور پکڑ گئی ہیں۔ اس ہنگامے اور انتشار کے پیچھے مجھے چند لوگوں کے پراسرار ہاتھ صاف نظر آرہے ہیں۔ یہ لوگ عوامی حکومت کو خفیہ طریقہ سے ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ بدامنی اور بے چینی پھیلائی جارہی ہے۔ نعرۂ رسالت 'یارسُولؐ' کا غلغلہ بلند کرتے ہوئے جیل سے قیدی فرار ہو رہے ہیں۔ باہر ٹیکسیاں ان کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہیں۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ صاحب میں مزدور ہوں، بہت کم عقل رکھتا ہوں مگر میں خطرہ کا بو سونگھ رہا ہوں، سانپ مرا نہیں ہے، زخمی ہے، زخمی سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ کیا آپ اس سازش سے پردہ اٹھا سکتے ہیں!

علی محمد سائیں حیدر آباد۔

کے ڈی اے کی بھی خبر لیجئے

عوام کو صحیح سیاسی شعور دینے اور قومی تعمیر نو کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی میدان سے "سیاسی وڈیروں" کا صفایا کیا جائے۔ ساری جاگیرداری اور زمینداری ختم کی جائے، وڈیروں اور جاگیرداروں کو کوئی معاوضہ نہ دیا جائے۔ رہائشی پلاٹ کے لئے کے ڈی اے کے تمام الاٹمنٹ منسوخ کئے جائیں۔ خالی رہائشی پلاٹوں کی تقسیم از سر نو کی جائے۔ جو کمونٹی فلیٹوں کے لئے ۲ سو گز سے زیادہ نہ ہو۔

انصاری مسلم لیگ کوارٹرز، ناظم آباد کراچی۔

شیخ مجیب اور ہارون خاندان؟

سُننے میں آیا ہے کہ شیخ مجیب الرحمان نے لندن پہنچنے کے فوراً بعد مسٹر محمود ہارون کو ٹیلیفون کیا۔ فون پر کیا بات چیت ہوئی اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا البتہ ماضی میں مجیب الرحمان اور ہارون فیملی سے گہرے تعلقات کے بنا پر یہ قیاس ارائیاں کی جا رہی ہیں کہ دونوں کے درمیان مشترکہ مفادات کے امور پر کچھ نہ کچھ بات چیت ضرور ہوئی ہوگی۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھیئے کہ ایک خاص مقصد کے حصول کے تحت مشرقی اور مغربی پاکستان کے مظلوم عوام کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کر دی گئی۔ جبکہ استحصالی طبقے سے تعلق رکھنے والے بڑے سرمایہ دار جنہوں نے قومی سیاست میں بدنما کردار انجام دیا، بیٹھے بن گئے۔

تحسین علی لانڈھی کورنگی کراچی۔

بقیہ: بحری وڈیرے

یو اے سعید کا ایک اور اسکینڈل "مانٹرز" نامی فرم تھی۔ اسے یو اے سعید نے شپ چینڈلرز نامی ایک فرم کے مالک سے مل کر کسی بوگس نام سے قائم کر دیا تھا اور جہازوں کی مرمت کے ٹھیکے دے کر لاکھوں روپے ناجائز طور پر وصول کئے شپ چینڈلرز کے خلاف این ایس سی کی بدعنوانیوں کی تحقیقات کرنے والی کمیٹی تحقیقات کر رہی ہے۔

اور وڈیرے۔!

یو اے سعید اور بحریہ کے سابق کمانڈر انچیف مظفر حسن نے مل کر بحریہ میں ناجائز ترقیوں کا جو سلسلہ شروع کیا اس میں بڑے بڑے بدعنوان افسران کو ایک ایکٹ کے تحت ترقیاں دی گیئں۔ کموڈور ایس ایم انور کو محض اس بنیاد پر ترقی دی گئی ہے کہ وہ احسن کے دوست تھے۔ کموڈور ایم اے عزیز سابق سی این سی مظفر حسن کے قریبی رشتہ دار ہیں انہیں پورٹس اینڈ شپنگ کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ اس محکمہ کا تعلق براہ راست نیشنل شپنگ کارپوریشن سے ہے اور اس کے رابطے کے بغیر دھاندلیاں ممکن نہیں ہیں۔ اس عہدے پر سی این سی کے رشتہ دار کا تقرر اس لئے کیا گیا کہ یہ کموڈور یو اے سعید کی دھاندلیوں میں برابر کے شریک تھے کموڈور ایم، این منجاوح کو اس کی تمام نااہلی اور ملک سے اپنی غداریوں کے بارے میں شہرت رکھنے کے باوجود اسے لندن کے ہائی کمشن میں بحریہ کا خصوصی مشیر اور سنیئر ملٹری ایڈوائزر مقرر کیا گیا محض اس لئے کہ وہ سابق سی این سی مظفر حسن کا خصوصی دوست تھا۔ اس کا رشتہ کا ایک بھائی کیپٹن منگاون بھارتی بحریہ میں افسر ہے اور اُسے بھی بھارتی ہائی کمیشن میں بحریہ کا مشیر مقرر کیا گیا ہے کموڈور کے ایم حسین پیشہ ورانہ طور پر کمانڈر کے بھی اہل نہیں تھے لیکن یہ احسن کے نیلی آنکھوں والے لونڈے کے طور پر مشہور ہیں اور مظفر حسین سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ کموڈور ایم اے طوسی سابق مرچنٹ نیوی افسر ہیں۔ اپنے موجودہ عہدے اور پوسٹ کے لئے قطعاً نا اہل ہیں اور انہیں بھی محض مظفر حسن کی دوستی

کی وجہ سے اس عہدہ تک پہنچنا نصیب ہوا۔ کموڈور زبیدہ اے بی عابد انجینئرنگ افسر تھے لیکن اس فنی عہدے کے لئے قطعی ناموزوں تھے۔ نیوی میں شامل ہونے سے پہلے وہ ریلوے میں ٹیکنیشن تھے۔ لیکن یہ زیادہ تر غیر فنی عہدے پر رہے ـــــ موجودہ فنی عہدے پر جب کہ ایک فنی تربیت یافتہ آدمی کی ضرورت تھی، انہیں یہاں متعین کیا گیا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ یہ بھی مظفر حسن کے دوستوں میں سے ایک تھے ـــــ کموڈور ایس۔ ایس ایچ رضوی الیکٹریکل انجینئر کو پاکستان نیوی ڈاکیارڈ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ یہ تقرری بھی ایک مذاق تھی کیونکہ وہ اس عہدے کے لئے قطعی طور پر مستحق نہیں تھا۔

یہ سارے بحری وڈیرے جن کی قابلیت اور اہلیت کی بنیاد صرف یہ ہے کہ وہ بدعنوان سی این سی کے حلقہ احباب میں شامل رہے ہیں۔ ایک زنجیر کی مانند بحریہ جیسے اہم ادارے کو جکڑے رہے ہیں ـــــ ان میں بہت سے چہرے عیاں ہو چکے ہیں اور بہت سے ابھی ظاہر ہونے باقی ہیں لیکن بڑے پیمانے پر بدعنوان "وڈیروں" کی تطہیر میں وہ بھی نہیں بچ سکیں گے

بقیہ: المیہ کے اسباب

مقدمہ دائر کیا گیا۔ مدیر الفتح کو مارشل لاء کورٹ کے کئی طواف کرنے پڑے، مارشل لاء کورٹ کے برآمدے میں گھنٹوں اُسے کھڑا رکھا گیا۔ توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ لیکن اس نے حق گوئی کا راستہ نہ چھوڑا، اور نہ اب ترک کیا ہے۔ لیکن اس سے برعکس ہمارے ملک کے "عظیم صحافی" رنگ رلیوں میں مصروف تھے اور ہیں، ہمیں ان سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں، ہم صرف ان سے حقائق معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو قومی مفاد عزیز ہے اور وہ اس سازش میں شریک نہیں ہیں تو انہیں حقائق بتانے سے گریزاں نہیں ہونا چاہیئے۔

ہم نوکر شاہی کے ان افراد سے جو یحییٰ حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، چاہتے ہیں کہ وہ آگے بڑھیں اور ان عناصر کی نشاندہی کریں جو اس شکست میں کارفرما تھے انہیں شکست کے اسباب کا تجزیہ کرنا چاہیئے تاکہ ہم مستقبل میں اس غلطی کا اعادہ نہ کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ فوج کے اعلیٰ حکام بھی ان وجوہات کی نشاندہی کریں جس کی وجہ سے شکست سے دوچار ہونا پڑا، ہم ٹیلی ویژن پر ہتھیار ڈالنے کی رسم دیکھنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ہمیں یہ بتایا جائے کہ فوجی شکست کی بنیادی وجوہات کیا تھیں، فوج نے ہتھیار کیوں ڈالے؟ موجودہ حکومت سے ہم چاہتے ہیں کہ وہ عوام کو تمام حقائق سے آگاہ کریں۔

ایک عام آدمی سے زیادہ محب وطن کوئی نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر پاکستانی کا بنیادی حق ہے کہ اسے اس المناک شکست کے اسباب بتلائے جائیں، ہماری موجودہ حکومت سے اپیل ہے کہ عوامی مفاد کے پیش نظر وہ اپنے پیشرو غلام محمد، اسکندر مرزا، ایوب خان اور یحییٰ خان کے نقش قدم پر نہ چلے، ہم نہیں چاہتے کہ پرانے طریقے مثلاً افسروں کی برطرفیوں، غیر ممالک سے دولت کی واپسی وغیرہ، دوبارہ آزمائے جائیں۔ ہم جائز، سنجیدہ اور حب الوطنی سے بھرپور اقدامات کی توقع کرتے ہیں۔ تاکہ پاکستان کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے تعمیر نو کی جاسکے۔ یہ ملکی بحران افراد کا نہیں بلکہ ایک نظام کی پیداوار تھا۔ جس کا اعتراف صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اپنی پہلی تقریر میں کیا۔

درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام ہی اس قومی المیہ کا بنیادی ذمہ دار ہے، یہ استحصالی طبقوں کی استحصال زدہ عوام کے خلاف صف آرائی تھی۔ استحصالیوں نے ایک عام آدمی کے استحصال کو برقرار رکھنے کے لئے معاشرہ کو تباہ کر دیا خون سے رنگ دیا۔ وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ یہ استحصالی، اپنے استحصال کو برقرار اور استحصال پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے اس بات کے حامی تھے کہ اگر پاکستان کے دونوں بازوں میں وہ استحصال نہیں کر سکتے۔ تو ایک بازو چھوڑ دیا جائے تاکہ دوسرے بازو میں وہ عوام کا استحصال کرتے رہیں، پاکستان کا حالیہ بحران استحصالی اجارہ داری کا بحران تھا۔ یہ بحران سرمایہ دارانہ بحران تھا، جس میں سرمایہ داروں کا ایک گروہ مشرقی پاکستان میں استحصال کا حق چاہتا تھا۔ جب کہ مشرقی پاکستان کے استحصال پر سرمایہ داروں کے دوسرے گروہ کی اجارہ داری تھی، چھ نکات کی بنیاد سوشلزم پر نہیں تھی چھ نکات کا مشرقی پاکستانی عوام کے مفادات سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا چھ نکات دراصل مشرقی پاکستان کے اُن اُبھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقہ کے مفادات کی ترجمانی کرتے تھے، جو عوام کے استحصال میں اپنے حصے کے طلب گار تھے۔ بنیادی طور پر جھگڑا اس بات پر تھا کہ مشرقی پاکستانی عوام کے استحصال پر کس کی اجارہ داری ہو، غیر ملکی قرضہ جات پر کس کی اجارہ داری ہو اور کون سا فریق غیر ملکی امداد اور قرضوں کے بارے میں گفت و شنید کرے اور اُسے تقسیم کرے اور کس فریق کے پاس عوام کے نام پر عوام کا استحصال کرنے کے لئے نئے صنعتی اداروں کے قیام کی کنجی ہوگی۔

پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جس کا پروگرام ایک عام آدمی کے استحصال کے خلاف ہے۔ ہم یہ امید کرتے ہیں کہ سازش کے ابتدائی اور ثانوی حقائق ظاہر کئے جائیں گے جب معلوم ہوگا کہ استحصال کو مضبوط اور برقرار رکھنے کے لئے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ اور جب سازش کے حقائق بے نقاب کئے جائیں گے۔ تو اس میں قومی پریس کے کردار کا بھی ذکر ہوگا۔

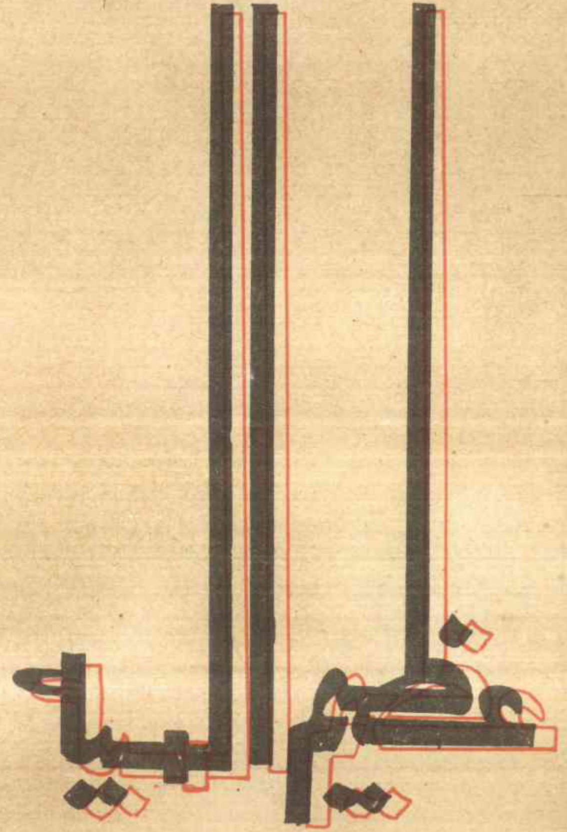
بقیہ: تخریب کار کیمپ

فاقے بھی کرنے پڑے، ایک جگہ تخریب کاروں نے ہمیں گھیر لیا انہوں نے رائفل چلائی، جس سے دوسرا لڑکا بھی ہلاک ہو گیا۔ میں نے اور ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لڑکا زمین پر تڑپ رہا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہا تھا مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ اگر اسے بچانے کے لئے ٹھہرتے تو تخریب کار ہمیں دوبارہ گرفتار کر لیتے۔ ہم اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر بھاگ نکلے اس طرح بھاگتے بھاگتے ایک مہینہ گزر گیا۔ اور آخر ہم دونوں (ڈرائیور اور رشید) کوئٹہ پہنچ گئے۔

ڈرائیور مجھے لے کر سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ہم نے تھانیدار کو ساری باتیں بتائیں۔ تھانیدار نے ہمیں تھانے کے ایک کمرے میں چھپا دیا۔ تھوڑی دیر بعد کئی تخریب کار اس جگہ پہنچ گئے اور تھانیدار سے کہا "ہمارے دو ملازم یہاں چھپے ہوئے ہیں، انہیں ہمارے حوالے کرو"۔ تھانیدار نے جواب دیا "نہیں وہ ہمارے پاس نہیں آئے"۔ تخریب کاروں نے بہت ضد کی۔ دھمکی بھی دی۔ مگر تھانیدار نے ہمیں ان کے حوالے نہیں کیا۔ آخر وہ تھک ہار کر چلے گئے۔ بعد میں تھانیدار نے بتایا کہ "وہ تخریب کاروں کے خلاف کوئی نہیں کر سکتے بہت طاقتور ہیں، خونی اور رقاتل ہیں۔ بلوچستان کے ایسے علاقوں میں ان کے کیمپ ہیں جہاں ہم نہیں پہنچ سکتے۔ حکومت اور علاقہ کے بڑے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں، ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ البتہ ہم تمہیں یہاں سے لاہور بھجوا سکتے ہیں"۔ ہم دونوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "صاحب آپ ہمیں کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکال دیں۔ اگر انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تو ہمیں مار ڈالیں گے"۔

تھانیدار نے ایک ٹی ٹی کو بلوا کر ہمارے سارے حالات بتائے اور اُس سے کہا کہ "انہیں کسی مال گاڑی کے ڈبے میں چھپا کر لاہور بھجوا دو"۔ ریلوے کا ملازم خدا ترس آدمی تھا۔ اسے ہماری حالت پر رحم آ گیا دوسرے دن اس نے ہمیں ایک مال گاڑی کے ڈبے میں جگہ دلا دی، جس میں بھینسیں بند تھیں۔ اس طرح کوئٹہ کے تھانیدار اور ٹی ٹی محمد حسین کی مہربانی سے ہم دونوں لاہور پہنچ گئے ڈرائیور کا گھر موچی دروازے کے پاس تھا اسے اچانک گھر پر دیکھ کر اس کے ماں باپ، بیوی اور دو بچے بہت خوش ہوئے۔ میں اس کے گھر دو تین روز ٹھہرا اس کے بعد کراچی چلا آیا۔ کیوں کہ مجھے یاد ہے کہ میرا گھر کراچی میں تھا۔ کراچی کینٹ اسٹیشن کی پولیس چوکی پر میں نے اپنا سارا حال لکھوا دیا۔ یہاں ایک اللہ کا بندہ مل گیا۔ جس نے مجھے اپنی دکان پر ملازم رکھ لیا۔ اگر میرے حالات اور تصویر دیکھ کر میرے والدین مجھے پہچان لیں۔ تو وہ مجھے فوراً خبر کریں۔ ان کے بغیر میں زندہ درگور ہوں، میرے بعض زخم ناسور بن گئے ہیں، علاج کروا رہا ہوں۔

مصنف ذوالفقار علی بھٹو



تیسرا ایڈیشن چھپ چکا ہے

غیر مجلد — ۲ روپے

مجلد چرمی — ۴ روپے

شوکت صدیقی

کا

شہرۂ آفاق ناول

خدا کی بستی

شائع ہوگیا ہے

اپنے قریبی بک اسٹال طلب کریں

صفحات: ۷۰۴   قیمت: ۱۲ روپے

سرورق

چار رنگوں میں

الفتح مطبوعات ۷۰۸ ڈی - نرسری، کمرشیل ایریا - کراچی

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
27 JAN.-3 FEB. 1972

اب نئے پاکستان کی تعمیر کریں

خدا کا شکر ہے کہ پاکستان ہزار مشکلوں کے طوفان سے نکل آیا ہے۔ آئیے اب ہم سب فخرِ قوم، صدرِ محترم، قائدِ عوام جناب

ذوالفقار علی بھٹو

کے ارشادِ گرامی کے مطابق خوش حال پاکستان تعمیر کریں۔

ایک ایسا پاکستان جہاں ہر خاندان کے پاس سر چھپانے کو جگہ ہو، خدا کے فضل و کرم اور چہاردہ معصومینؑ کے طفیل ہم اب اپنی معروف اسپیشل ریزرولیشن اسکیم عوام کے لئے پیش کرتے ہیں، جس میں

ہر شخص محض پچاس روپے ماہانہ بچا کر پلاٹ حاصل کرسکتا ہے

اس کی اس جمع شدہ رقم پر اُسے پلاٹ کے ساتھ شادی بیاہ کے لئے قرض بھی مل سکتا ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی شخص اس سکیم کا ممبر بننے کے بعد خواہ ایک ماہ بعد ہی انتقال کرجائے تو اس کے ورثاء سے مزید کوئی رقم لئے بغیر پلاٹ دیا جائیگا

ہم نے فوجی بھائیوں کو جو رعائتیں دی ہیں اُن پر ہمیں تحسین و آفرین کے جتنے بھی پیغامات اور خطوط ملے وہ ہمارے لئے بلاشبہ فخر کا باعث ہیں۔ اگرچہ ہم ان سب باتوں کے قائل نہیں ہیں۔ ہم اس اشتہار کے ذریعے تمام کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں

بوستانِ رضا

اب آخری مراحل میں ہے جلد رجوع کریں تاکہ آپ اس موقعہ سے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ دفتر اتوار کو بھی کھلا رہے گا

سلطان لمیٹڈ

۱۴۱ محبوب چیمبرز۔ صدر۔ کراچی
فون — 516389